ملک وملت کے نازک مسائل

اور

ہماری ذمہ داریاں

سید جلال الدین عمری

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ملک و ملت کے حالات اور مسائل پر راقم الحروف کو کبھی کبھی کچھ لکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ کے مضامین کا ایک مجموعہ "یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟" کے عنوان سے کئی سال قبل شائع ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے اسے توجہ اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعض احباب نے محسوس کیا کہ اس میں ہمارے مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ایک سے زائد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہندی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا مجموعہ — ملک و ملّت کے نازک مسائل اور ہماری ذمّے داریاں — پیش خدمت ہے۔ اس کے مضامین خاصے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر مضمون کے آخر میں اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ دے دی گئی ہے۔ اس سے اس کا پس منظر اور جن حالات میں وہ لکھا گیا اسے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وقت کے ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا اثر تحریر اور تقریر پر پڑتا ہے۔ لیکن ان میں سے بیش تر مضامین اصولی نوعیت کے ہیں۔ امید ہے حالات کی تبدیلی کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں محسوس ہوگا۔ جن مضامین میں ملک وملت کے متعین مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کی اہمیت آج بھی دو وجوہ سے اپنی جگہ برقرار ہے۔ ایک یہ کہ ابھی وہ مسائل حل طلب ہیں اور اس کے لیے جدو جہد جاری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان میں بعض ان بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن سے کسی حال میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

ان مضامین کا لکھنے والا اسلام کو ملک وملت کے تمام مسائل کا واحد حل تصور کرتا

ہے۔ اس کا یہ نقطۂ نظر بعض مضامین میں تفصیل سے اور بعض میں اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پوری دنیا اور خود اس ملک میں شدید غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کا جب تک ازالہ نہ ہو اسلام کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی۔ ان مضامین میں بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان مضامین میں سے ہر مضمون اپنی جگہ مستقل ہے اور ہر مضمون میں مضمون نگار کا نقطۂ نظر موجود ہے۔ اس وجہ سے ان میں کہیں کسی قدر تکرار کا احساس ہو تو درخواست ہے کہ اسے مضمون کی ضرورت سمجھ کر گوارا کیا جائے۔

ہمارے ملک کو سیاسی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور اخلاقی بہت سے مسائل درپیش ہیں، ملت بھی ان سے دوچار ہے۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اس مجموعہ میں ان سب سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ صرف بعض اہم اور نازک مسائل پر اسلام کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

بہت سے لوگ اسلام کو بے وقت کی راگنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اپنے اندر انسان کے پیچیدہ ترین مسائل کا بہت ہی فطری اور موزوں حل رکھتا ہے۔ اسلام ماضی کا ورثہ یا تاریخ کا حصہ بن کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کی ہدایات پر غور و فکر کا رجحان ہر جگہ پایا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر دنیا کی تعمیر نو کی کوششیں جاری ہیں۔ اگر ان مضامین کا رخ یہی ہے اور ان میں ملکی اور ملی مسائل کو اسلام کی روشنی میں دیکھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ کوئی حیرت اور استعجاب کی بات نہیں ہے، اس لیے توقع ہے کہ ان مضامین کو ایک بے مایہ کے خیالات یا قدیم مذہبی فکر کے ترجمان سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جائے گا بلکہ سنجیدہ توجہ کے مستحق سمجھا جائے گا۔ اگر ان سے ملک و ملت کے پیچیدہ مسائل کے حل میں کسی قسم کی کوئی مدد ملتی ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

ان مضامین میں سے بیشتر ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی، سہ ماہی، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مضمون سہ روزہ، دعوت، نئی دہلی کے خاص نمبر کے

لئے لکھا گیا تھا۔ ان میں سے بعض مضامین دوسرے رسائل میں بھی نقل ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کرنے سے پہلے ان میں حسبِ ضرورت حذف واضافہ اور ترمیم کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ مضامین لکھے گئے ہیں وہ پورا ہو، انہیں مقبولیت عطا ہو اور وہ اس عاجز کے لیے اجر آخرت کا ذریعہ ثابت ہوں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

جلال الدین عمری

۳/جولائی ۲۰۰۱ء

جدید ہندوستان میں
مسلمانوں کے مسائل

دی اسلامک اکیڈیمی آف ہسٹری آف انڈیا، کے تحت ۱۶/۱۵/اگست ۱۹۸۷ء کو حیدرآباد میں ''آزادی کے چالیس سال۔ مسلمانوں نے کیا کھویا کیا پایا؟'' کے عنوان کے تحت ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ذیل کا مقالہ راقم نے اسی کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ (جلال الدین)

ہمارا ملک ہندوستان لاکھوں مربع میل پر پھیلا ہوا ایک خوبصورت ملک ہے۔ اس کی آبادی چین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی آبادی ہے۔ یہاں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ مختلف قوموں، نسلوں اور مختلف رنگ روپ کے لوگ بستے ہیں، ان کی زبانیں مختلف ہیں، تہذیبیں جدا ہیں، طور طریقے اور رسوم و رواج الگ ہیں۔ اس اختلاف کے باوجود اس کے وسیع جغرافیائی حدود میں رہنے والا ہر فرد اس کا باشندہ اور اس کا شہری ہے۔ اسے وہ سارے حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے فرد کو حاصل ہیں۔ یہاں ازروئے دستور یہ بحث ہی نہیں پیدا ہوتی کہ اس کا کس علاقہ اور کس نسل سے تعلق ہے، اس کا رنگ کیا ہے، پیشہ کیا ہے اور وہ کس مذہب یا کس عقیدہ کا ماننے والا ہے؟

اس ملک کی آبادی کا ایک اہم حصہ مسلمان بھی ہیں۔ جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس ملک سے ان کا تعلق کم از کم تیرہ سو سال پرانا ہے۔ یہ تعلق مختلف حیثیتوں میں مسلسل باقی رہا، کبھی ٹوٹا نہیں۔ اس طویل عرصہ میں اس ملک کی تعمیر و ترقی

اور تہذیب وتشکیل کے لئے انہوں نے ان تھک جدوجہد کی، اپنا خون پسینہ بہایا اور بڑی قربانیاں دیں۔ اس زمین کو انہوں نے پردیس اور غیر ملک تصور نہیں کیا۔ اسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا اور اپنے گھر ہی کی طرح اس کی زیبائش وآرائش کا سامان کیا، اسے اجاڑ کر یا اسے لوٹ کر کسی دوسرے ملک کو آباد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے خلوص ومحبت کو اپنے لیے فرض سمجھا اور اس سے غداری اور بے وفائی کو گناہ تصور کیا۔ اس ملک کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ ان کی وفاداری، محبت اور تعلقِ خاطر کی شہادت دے رہا ہے۔ ان کی وفاداری اور قربانی کا ہر وہ شخص اعتراف کرے گا جو خود بھی وفادار اور وفاشناس ہے۔ ہاں کسی بے وفا سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وفاداری جیسے جوہر نایاب کی وہ قدر کر سکے گا۔ اس ملک پر ان کا اسی طرح حق ہے جس طرح دوسری قوموں کا حق ہے۔ یہاں کسی بھی قوم کو کسی بھی معاملہ میں نہ تو کوئی خاص استحقاق حاصل ہے اور نہ اس کا حق کسی دوسری قوم سے کم ہے۔

نوّے کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد حکومت کے اعداد وشمار کے لحاظ سے بارہ کروڑ ہے۔ ہم اسے اقلیت اصطلاحی معنی میں تو کہہ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ 'اقلیت' کئی ایک مسلم ممالک کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد سوائے انڈونیشیا، بنگلہ دیش، اور پاکستان کے کسی مسلم ملک میں بھی نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی آبادی کے ملک ہی دنیا کے نقشہ پر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچئے کیا اس بے پناہ آبادی کے مسائل نہیں ہوں گے یا کچھ کم ہوں گے؟ مسائل سے خالی تو کسی فرد کی زندگی بھی نہیں ہوتی پھر اتنی بڑی ملّت کے بارے میں کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ وہ مسائل سے بالکل آزاد یا دو ایک اہم مسائل میں گرفتار ہوگی۔ ان سے ہٹ کر اسے کوئی بڑی فکر اور پریشانی لاحق نہ ہوگی۔ اس امت کے مسائل ہیں اور گوناگوں اور مختلف نوع کے مسائل ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے بھی مسلمانانِ ہند بہت سے مسائل سے دوچار تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات میں تبدیلی آئی، بعض نئے مسائل پیدا ہوئے اور بعض مسائل نے شدت اختیار کرلی۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم ڈیڑھ سو سال پہلے سے بات شروع کرنا چاہتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہندوستان کا اقتدار چھینا تھا۔ مسلمان ان کے اقتدار اور حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور انگریز انہیں اپنا سب سے بڑا سیاسی حریف بلکہ حکومت کا باغی تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اس مزاحمت کو طاقت کے زور سے جس طرح کچلا گیا اس خونین داستان کا بیان بڑا دل خراش اور صبر آزما ہے۔ یہاں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ انگریزوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمان طاقت نہ پکڑیں اور ابھرنے نہ پائیں۔ چنانچہ وہ ہر میدان میں پیچھے رہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ پیچھے کیے گئے۔

ملک میں جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو یہ مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے قافلہ سالاروں میں شامل ہوگئے۔ ہر طرح کی قربانیاں دیں اور آبادی میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ آزادی کی قیمت ادا کی۔ یہ سب کچھ اس جذبہ کے تحت تھا کہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوجائے تو وہ برادرانِ وطن کے ساتھ سکون اور چین کی زندگی گزار سکیں گے اور ان کی ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خوابوں کے شیش محل ٹوٹ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آزادی آئی اور بڑے طمطراق سے آئی لیکن ان کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ انگریزوں کے دور میں وہ جہاں تھے وہیں رہے بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس سے بدتر مقام پر پہنچ گئے۔

آیئے اب آزادی کے بعد کے حالات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

۱- اگست ۱۹۴۷ء میں یہ ملک بھارت اور پاکستان کے نام سے دو حصوں میں تقسیم ہوکر آزاد ہوا۔ اس تقسیم نے یہاں کی اکثریت اور مسلمانوں کے درمیان ایک زبردست خلیج پیدا کردی۔ تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا اور کانگریس نے، جو اکثریت کی نمائندگی کررہی تھی بالآخر اس مطالبہ کو تسلیم کرلیا اور تقسیم کے معاہدے پر دستخط کرکے اس کی منظوری دے دی۔ اس مشترکہ یا متفقہ فیصلہ کے باوجود ایک طبقہ، جو کافی طاقت ور تھا اور جس کے اثرات بڑے وسیع تھے، برصغیر کے تمام مسلمانوں کو تقسیمِ ملک کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا۔ اس بحث کو فی الحال نظر انداز کردیجئے کہ تقسیم کے ذمہ دار صرف

مسلمان تھے یا ان میں اکثریت کے رہنماؤں کا بھی کوئی قصور تھا۔ بہر حال اس طبقہ کے نزدیک مسلمان مجرم تھے اور وہ ان کے اس جرم کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ اس طبقہ کا رویہ ان کے ساتھ معاندانہ بلکہ جارحانہ ہے اور وہ ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کر رہا ہے۔ ان جذبات کے درمیان آزادی کا سورج آگ اور خون کے سمندر میں نہاتا ہوا طلوع ہوا، فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، بستیاں ویران ہو گئیں، خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ کم از کم پورا شمالی ہند خون سے لالہ زار ہو گیا۔

۲- خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے جو زخم لگے ہیں وہ وقت گزرنے کے ساتھ مندمل ہو جائیں گے، جذبات میں اعتدال اور توازن پیدا ہوگا اور ملک امن و امان کی طرف پیش قدمی کرے گا لیکن آزادی کے چالیس برس گزرنے کے بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جس شدت کے ساتھ جاری ہے اور ان فسادات میں جس بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا نقصان ہوا ہے، اس سے اس خیال کی مسلسل تردید ہو رہی ہے۔ ان حالات میں فطری طور پر مسلمانوں میں عدمِ تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ ایک غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہاں ان کی کوئی بھی چیز کسی بھی وقت فسادات کی نذر ہو سکتی ہے۔

۳- دستورِ ہند کی رو سے مسلمان برابر کے شہری ہیں، لیکن ابھی تک اکثریت کے ایک خاص طبقہ کا ذہن یہ ہے کہ جب ملک تقسیم ہو گیا اور مسلمانوں کو پاکستان کی شکل میں ایک الگ خطۂ زمین مل گیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ مساوی سلوک کے لیے عملاً تیار نہیں ہے۔

۴- تقسیم ہند کی وجہ سے جس کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی اس ملک کا ایک خاص طبقہ مسلمانوں سے مستقل طور پر بدگمان ہے۔ بدگمانی کی عینک سے جب وہ دیکھتا ہے تو اسے مسلمانوں کا پورا کردار مشکوک نظر آتا ہے اور ان کے بے ضرر عمل کو بھی وہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس بدگمانی کی وجہ سے ان کی قربانیاں اور خدمات بھی شک و شبہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔ بدگمانی کی اس فضا میں ذرا سی بے احتیاطی سے

دونوں قوموں کے درمیان کوئی بھی افسوس ناک واقعہ پیش آسکتا ہے اور اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی دور دراز کا قیاس نہیں ہے بلکہ عملاً آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے اندر جارحیت کا رجحان بڑی شدت سے ابھرا ہے۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے طبقہ میں بھی اس رجحان کا پیدا ہونا سخت نقصان دہ ہے اور ملک کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر یہ رجحان کسی طاقت ور طبقہ میں پیدا ہو جائے تو اقلیتوں کے لئے اپنے وجود کو باقی رکھنا دشوار ہے۔ بدقسمتی سے اس طبقہ کی طرف سے ملک کی اکثریت میں اس رجحان کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس رجحان کو کنٹرول کیا جائے اور اس کی اصلاح کی تدابیر کی جائیں اقلیت کو متعصب، تنگ نظر، جارح اور ظالم قرار دیا جاتا ہے تاکہ اپنی جارحیت کے لیے وجہ جواز فراہم کی جاسکے اور یہ ثابت کیا جاسکے کہ اکثریت کے اندر جارحیت ہے تو یہ ردعمل ہے اقلیت کی جارحیت کا۔ اس کے لئے مسلمانانِ ہند کی پوری تاریخ کو بڑی بھیانک شکل دی جارہی ہے اور اسے ہندو مسلم کشمکش کی تاریخ بلکہ مسلمانوں کے ظلم و بربریت اور برادرانِ وطن کی مظلومیت اور محکومی کی تاریخ میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ تاریخ کو واقعات کا آئینہ کہا جاتا ہے لیکن اس مقصد کے لئے اسے اس طرح مسخ کیا جارہا ہے کہ وہ ایک خوفناک افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔

یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مسلمانوں کا دامن ہر عیب سے پاک ہے، ان سے غلطیاں نہیں ہوئیں یا نہیں ہوتیں، وہ جذبات میں مشتعل نہیں ہوتے یا ان سے جارحیت کا کبھی ارتکاب نہیں ہوتا۔ غلطی جس کسی سے بھی ہو اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور اس کی تلافی اور تدارک کی کوشش ہونی چاہیے۔ لیکن کسی فرد یا کچھ افراد کی غلطی سے پوری قوم کو مجرموں کے کٹہرہ میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جس قوم کے ہاتھ میں اقتدار ہو اسے بڑا فراخ دل اور وسیع الظرف ہونا چاہیے، جو قوم دوسروں کا احتساب کرنے اٹھے اسے پہلے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

جارحیت کے اس رجحان سے مسلمانوں کو سخت نقصانات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں

سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

۱- مسلمانوں نے اس ملک میں اپنی دینی، سیاسی، سماجی اور معاشی ضروریات کے تحت بہت سے ادارے قائم کئے ہیں۔ ان اداروں کو انہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے یہ ان کے تہذیبی مراکز بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہاں سے انہیں دین و ایمان کی دولت بھی ملے اور ان کی مادّی ضروریات بھی پوری ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے، ان کی امتیازی خصوصیات کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ان میں حکومت کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اقلیتی اداروں کی حیثیت سے انہیں چلانا مشکل ہے۔

۲- اردو ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی مادری زبان ہے۔ یہ ان کا فطری اور دستوری حق ہے کہ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے جائیں اور اُردو بولنے والوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس زبان کی اہمیت دینی لحاظ سے بھی ہے۔ یہ اپنے دامن میں دینی علوم کا بڑا مستند ذخیرہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے دین سے بآسانی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں لیکن اردو کے مراکز تک میں اس کے ساتھ جو بے التفاتی بلکہ ناانصافی ہورہی ہے اور ہندی کے فروغ کے نام پر اسے ختم کرنے کی جس طرح کوشش کی جارہی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تنگ نظری اور جارحیت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

مسائل ان کے علاوہ اور بھی ہیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہورہا ہے جیسے تعلیم کا مسئلہ، معاش کا مسئلہ ملازمتوں میں تناسب کا مسئلہ وغیرہ۔

بعض مسائل کا مسلمانوں کے دین سے براہ راست تعلق ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب ہیں کہ ایک خاص دائرے میں انہیں اپنے دین پر عمل کی از روئے دستور جو آزادی حاصل ہے اس پر بھی شب خوں جاری ہے اور وہ ہر وقت خطرے میں ہے۔

۱- کتنی ہی مساجد سے مسلمانوں کا عمل دخل ختم ہوچکا ہے اور کتنی ہی مساجد آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ اسی جارحیت کا بدترین مظاہرہ بابری مسجد کے سلسلہ میں ہوا

ہے۔ جس مسجد میں صدیوں سے مسلمان اللہ واحد کی عبادت کرتے تھے پہلے اس میں تالے لگائے گئے اور اب اسے رام جنم بھومی قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے زبردست احتجاج کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

۲- مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے دین کا ایک حصہ ہے۔ یہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی محفوظ رہا لیکن جدید ہندوستان میں یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بہت سی باتیں قابل اصلاح ہیں، ان کی اصلاح ضرور ہونی چاہیے ورنہ ملک ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ پر اصرار کیا جاتا ہے اور دستور ہند کے رہنما اصولوں میں اس کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانان ہند کے لیے سب سے زیادہ تشویش کا باعث ہے۔ جو لوگ مسلم پرسنل لا میں ترمیم چاہتے ہیں وہ دراصل اسلامی شریعت میں ترمیم چاہتے ہیں۔ اس ترمیم کا حق مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے، نہ کسی فرد کو حاصل ہے اور نہ کسی ریاست کو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ اس ملک میں جب بھی بنے گا وہ اکثریت کی روایات اور اس کے رجحان کے تابع ہوگا۔ ایک کمزور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یکساں سول کوڈ کا مطلب ہے مسلمان اقلیت کا اکثریت کے تابع ہو جانا۔ اسے مسلمان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔

۳- اس بات کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے بنیادی سرچشموں سے بدگمان کر دیا جائے اور یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی جائے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات اس دور میں اور ملک کے موجودہ حالات میں ناقابلِ عمل ہیں۔ اب تو یہ بات باور کرائی جا رہی ہے کہ قرآن وحدیث میں ایسا مواد پایا جاتا ہے جو ملک کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہے اور وہ مسلمانوں کو دوسری قوموں سے برسرِ پیکار رکھتا ہے۔ اس مواد کو حذف ہونا چاہیے یا اس میں مناسب ترمیم ہونی چاہیے۔ ان خرافات کی تائید بعض اوقات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے نام بدقسمتی سے مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس تائید کا انہیں صلہ مل جاتا ہے حالانکہ ان میں سے بیشتر افراد وہ ہیں جنہیں اسلام پر بولنے کا صحیح معنی میں کوئی حق نہیں ہے اور ان میں سے کسی کا مسلمانوں کے اندر کوئی وقار نہیں ہے۔

اس طرح کے اقدامات سے مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان کا دین، ان کے مقدس مقامات اور ان کی مقدس کتابیں سب جارحیت کی زد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ان کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں اکثریت کے ایک خاص ذہن کا ذکر ہے جو موثر اور طاقت ور ہے، جس کے اثرات سے اکثریت پوری طرح آزاد نہیں ہے، ورنہ اکثریت میں ایسے انصاف پسند افراد بھی ہیں جنہیں کمزوروں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جو نہیں چاہتے کہ کسی طبقہ کو ظلم وستم کا ہدف بنایا جائے اور اس کی ترقی کی راہیں روک دی جائیں لیکن یہ طبقہ موجودہ حالات میں بہت زیادہ موثر نہیں ہے یا اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ظلم کے خلاف برملا آواز اٹھائے اور کھل کر مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جائے۔ ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ یہ طبقہ مضبوط ہو۔ جب تک یہ مضبوط نہ ہو صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکتی۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے عملاً جو کوششیں ہو رہی ہیں یا جو کوششیں وہ کرنا چاہتے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- خود مسلمان اپنے ان مسائل سے کماحقہ واقف نہیں ہیں، بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اُن سے بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ جو قوم اپنے مسائل ہی سے بے خبر ہو وہ انہیں حل کیا کرے گی؟ لہٰذا انہیں ان مسائل سے باخبر کرنا اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ غفلت کی نیند سے جلد بیدار ہوں ورنہ ان کی متاعِ حیات لٹ جائے گی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

۲- ملک کی اکثریت کو مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کیا جائے اور بہ حسن و خوبی انہیں سمجھایا جائے کہ وہ کن مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، ان کی مشکلات حقیقی ہیں، فرضی نہیں ہیں۔ ان کی باتوں کو ایک حریف قوم کا شور وغوغا سمجھ کر وہ کان بند نہ کرلیں بلکہ آنکھیں کھول کر ان کے حالات کا جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی جمہوری ملک میں اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۳- اپنے حقوق کے لیے دستوری جدوجہد کی جائے۔ دستور ہند نے اقلیتوں کو جو ضمانتیں دی ہیں وہ مسلسل پامال ہورہی ہیں، ان ضمانتوں کو بحال کرایا جائے اور حکومت اور انتظامیہ کو ان کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

۴- انتخابی سیاست کے ذریعہ دباؤ ڈالا جائے۔ جمہوریت میں ووٹ کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی ایک طاقت ہوتی ہے۔ اب تک مسلمانوں کی اس طاقت سے اغیار فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور انہوں نے آنکھیں بند کرکے ان کے حق میں ووٹ دیا ہے لیکن اب وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اس طاقت کو استعمال کریں۔ صرف ان ہی امیدواروں کو یا ان ہی پارٹیوں کو ووٹ دیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لیں۔

۵- اپنے حقوق کے لیے جمہوری طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اس میں جلسے جلوس، مظاہرے، احتجاج وغیرہ تمام معروف ذرائع آسکتے ہیں۔

یہ تمام کوششیں کسی نہ کسی درجہ میں کی جارہی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی سیاست ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کوششیں منظّم طریقے سے ہوں تو ان کے کچھ نہ کچھ نتائج بھی برآمد ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں یہاں بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

یہ ساری کوششیں امت کے بقا اور تحفظ کی ہیں۔ یہ اس لیے ہیں تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا وجود باقی رہے، ان کا اثاثہ محفوظ رہے، ان پر کسی طرف سے کوئی حملہ نہ ہو، وہ معاشی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے کسی گراوٹ اور پستی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہ ایک بہت ہی پاکیزہ مقصد ہے۔ اس کی اہمیت سے کوئی بھی ایسا فرد جسے ملت سے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہو، انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ بظاہر حالات ایک طویل جدوجہد کی طالب ہیں۔ ہم نے چالیس پچاس برس کے عرصہ میں بہت تھوڑا سا راستہ طے کیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منزل بہت دور ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت یہ سارے مسائل حل ہوجائیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا کچھ اور مسائل اسی نوعیت

کے یا ان سے سخت نوعیت کے پیدا نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارا کام صرف ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا کام اس امت کے سامنے نہیں ہے؟

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس امت کے بقا و تحفظ کی کوشش ہو رہی ہے اس کا ایک مقصدِ حیات ہے، اسی نے اسے ایک امت بنایا ہے اور اسی میں اس کی بقا کا سامان بھی ہے۔ قوموں کو نہ تو مسائل زندہ رکھتے ہیں اور نہ وسائل۔ ان کی زندگی ان کے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر بیٹھے اس کی بقا کی ساری جدوجہد ناکام ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ امت اپنے مقصد حیات کو نہ بھولے بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی جدوجہد کرتی رہے۔ اس جدوجہد میں اس کا مرٹنا ہی اس کی کامیابی ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت اصل مسئلہ امت کے بقا و تحفظ کا ہے۔ دوسرے مسائل اس کے بعد کے ہیں۔ جس شخص کی جان پر بن آئے اور جو شدید کشمکشِ حیات سے دوچار ہو یا فقر و فاقہ نے جس کی کمر توڑ رکھی ہو اس کے سامنے مقصدِ حیات کی بحث کرنا فضول ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس پر غور و فکر کے لیے تیار ہی نہیں ہوگا۔

ہماری درخواست صرف یہ ہے کہ اس کے خیر خواہ اور مخلص اس کی جان بچانے کی ضرور فکر کریں اور اس کی غربت و افلاس کا علاج بھی ڈھونڈیں، لیکن ساتھ ہی اس کے دین و اخلاق کی طرف بھی توجہ دیں ورنہ اس کا امکان ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس زوال یافتہ معاشرہ کا ایک عام فرد ثابت ہو اور وسائلِ حیات فراہم ہو جانے پر تو اس کا بھی خطرہ ہے کہ وہ دوسروں سے بدتر نکلے۔ امت کا ہر فرد اس کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس لیے اس کی اس طرح تربیت ہونی چاہئے کہ امت کے مقاصد کو وہ ہمیشہ پیش نظر رکھے اور کسی قیمت پر اس کے مفاد کو نقصان نہ پہنچنے دے۔

اس معاملہ میں فرد اور قوم کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ مسائل و مشکلات ہو سکتا ہے کسی فرد کو کچل کر رکھ دیں لیکن بامقصد قوموں کو حیاتِ تازہ عطا کرتی ہیں، حالات کی ہر چوٹ ان کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور وہ زیادہ قوت کے ساتھ

اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں۔ اقبال تو ہر فرد سے کہتے ہیں

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی

یہ اصول فرد سے زیادہ قوموں پر منطبق ہوتا ہے۔ بامقصد قوم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ رکاوٹ جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی دفاعی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود نکالتی چلی جاتی ہے۔ جو قوم مسائل و مشکلات میں الجھ کر اپنے مقصد حیات ہی کو بھول جائے وہ تا دیر باقی نہیں رہ سکتی۔

اس وقت امت کا حال یہ ہے کہ وہ سوچتی ہے تو زیادہ سے زیادہ اپنے بقا و تحفظ اور ملّی تشخص کے بارے میں سوچتی ہے، اپنی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی پر غور کرتی ہے، ملکی اقتدار میں شرکت اور اپنے دستوری حقوق کی فکر کرتی ہے۔ سوچتی بھی ہے تو کسی بلند تر سطح سے نہیں بلکہ ایک کمزور اور ناتواں قوم کے دل و دماغ اور نفسیات کے ساتھ سوچتی ہے۔ وہ ہر قدم پر اس احساسِ کم تری سے دوچار ہے کہ ملک کی اکثریت ہر پہلو سے اس سے آگے، تمام حقوق کی مالک اور اس سے طاقت ور ہے۔ اس کے برعکس اس کے حقوق یہاں محفوظ نہیں ہیں اور اس کی راہ میں ایسی بے شمار رکاوٹیں ہیں جن پر قابو پانا اس کے لیے مشکل ہے۔ یہ باتیں کسی حد تک صحیح ہوسکتی ہیں، اس کے لیے سندِ جواز بھی فراہم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے امت کی تصویر ایک مظلوم و مقہور گروہ کی بن کر اُبھرتی ہے۔ عملاً اس کی یہی تصویر دنیا کے سامنے آرہی ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق اور مفاد کے لیے دریوزہ گری کرتی پھرے یا پھر اس کے لئے جدوجہد اور مقابلہ آرائی کا راستہ اختیار کرے۔ ظاہر ہے اس سے عام برادرانِ وطن اور اُن کے مختلف طبقات کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ کوئی اس کی مظلومی پر ترس کھائے تو یہ اس کی اخلاقی بلندی ہوگی، امت کی عظمت کا ثبوت نہیں ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ امت بے شمار مسائل میں گھری ہوئی ہے اور اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلام کی امین ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری دین اپنی صحیح شکل میں اس کے پاس موجود ہے۔ اس دین کی بدولت وہ صاف ستھرا عقیدہ رکھتی ہے، اس کے پاس دنیا و آخرت کی کامیابی کا تصور ہے،

بہترین طریقۂ عبادت ہے، اخلاق کے اعلیٰ اصول ہیں، متوازن معاشی فکر ہے، عدل و انصاف کے محکم ضابطے ہیں اور خدا پرستی پر مبنی حکومت کے واضح خطوط ہیں۔ اللہ کا یہ دین اس ملک ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے باعثِ خیر ہے۔ یہ اس کی فلاح کا ضامن ہے، اسی سے اس کی نجات وابستہ ہے۔ اس امت کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دین کی داعی ہے۔ اسے اس کی دعوت و اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنی اس حیثیت کو سمجھے، اپنی کمزوریوں پر قابو پالے اور اس دین کی دعوت کو لے کر اُٹھے اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں لگ جائے تو وہ اس ملک کو وہ کچھ دے سکتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔

یہ ملک ایک زبردست نظریاتی خلا سے دوچار ہے، اس کی تعمیر کا واضح نقشہ اس کے سامنے نہیں ہے۔ وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور لسانی لحاظ سے افتراق کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے شاکی اور ایک حصہ دوسرے حصے سے برسرپیکار ہے۔ دل پھٹ چکے ہیں، منافرت اور تعصب کی آگ ہر طرف بڑھ رہی ہے۔ ان حالات میں بظاہر اس ملک کو متحد اور ایک وحدت بنائے رکھنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ البتہ اسلام اس ملک کو جوڑنے والی طاقت بن سکتا ہے۔ وہ یہ تصور دیتا ہے کہ سارے انسان رنگ، نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں۔ سب کی نجات اسی ایک خدا کی عبادت اور بندگی میں ہے۔ اسی تصور کے ذریعہ ملک کو اختلاف اور انتشار سے بچایا جاسکتا ہے اور اس کے اتحاد کو باقی رکھنا ممکن ہے۔

اس طرح اگر یہ امت اسلام کو ایک متبادل نظامِ فکر و عمل کی حیثیت سے پیش کرے اور یہ ثابت کردکھائے کہ اس کے پاس وہ دولت ہے جو ہندستان کے کسی دوسرے گروہ کے پاس نہیں ہے تو ایک وقت آئے گا کہ ہندستان یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اس امت کا مقام قیادت اور رہنمائی کا ہے۔ وہ کچھ آئینی حقوق کی طالب ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں کچھ دینے کی بھی پوزیشن میں ہے۔ اسی سے امت کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ مختلف طبقات اور گروہوں کے ساتھ برابر کی سطح سے بلکہ اونچی سطح سے بات

کر سکے گی۔ یہ ملک اسے قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو یہ اُمت اس ملک کی محسن اور نجات دہندہ ثابت ہوگی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کی جدوجہد شروع ہوتے ہی اس ملک میں امت کے موجودہ مسائل ختم ہوجائیں گے۔ اس وقت بھی مسائل ہوں گے، موجودہ مسائل سے زیادہ ہوں گے اور شدید تر ہوں گے۔ آپ کی دعوت کو چیلنج کیا جائے گا، اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی، آپ کی چھوٹی بڑی ایک ایک کوتاہی زیر بحث آئے گی اور رکاوٹ بنے گی۔ آپ پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا الزام عائد ہوگا، آپ پر سختیاں ہوں گی حتیٰ کہ دار و رسن ہوگا۔ لیکن اسی میں اسلام کے ساتھ آپ کے تعلق اور خلوص کا امتحان بھی ہوگا اور اسی سے امید ہے بدگمانیاں دور ہوں گی اور اسلام کے فروغ کی راہیں کھلیں گی۔ دعا ہے کہ ہم اس امتحان میں کامیاب ہوں۔

(یہ مضمون پہلے ۱۹۸۷ء میں ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی ستمبر، اکتوبر کے دو شماروں میں شائع ہوا، پھر ماہنامہ ''افکار ملی'' کے ''مسلم معاشرہ نمبر'' فروری، مارچ ۱۹۹۷ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ وہاں سے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' لاہور اگست ۱۹۹۷ء میں نقل ہوا۔)

کچھ ہم سب کے سوچنے کی باتیں

(بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں)

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کردی گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں آگ سی لگ گئی، ہولناک فسادات کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا، قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہوا، غلط کاروں اور مفسدوں کے ساتھ سیکڑوں بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں، ہزاروں افراد زخمی ہوئے، عصمتیں لٹیں، مکانات جلے، دکانیں نذر آتش ہوئیں، کاروبار تباہ ہوئے، اربوں اور کھربوں کا مالی نقصان ہوا، لوگ گھروں سے بے گھر ہوگئے، عبادت گاہوں تک کی حرمت پامال ہوئی اور وہ تباہ ہوئیں۔

فسادات کی ہولناکی اور جان و مال کی تباہی کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو ۱۹۴۷ء یاد آگیا، کسی نے اسے ملک کی حالیہ تاریخ کا سیاہ ترین باب قرار دیا، کسی نے کہا کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد یہ سب سے بڑا قومی حادثہ ہے، گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ انہیں قتل کرکے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، بابری مسجد کو شہید کرنے والوں کا بھی یہی مقصد ہے۔ دونوں کے پیچھے ایک ہی ذہن کام کررہا ہے۔

اس خوفناک صورت حال نے سوچنے سمجھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات ابھرنے لگے۔ کیا ہمارے اس ملک میں واقعی قانون کی حکم رانی ہے یا کوئی گروہ اپنی طاقت کے بل پر یہاں من مانی کرسکتا ہے اور اسے روکا نہیں جاسکتا؟ ملک کے سیاسی نظام کی بنیاد سیکولرزم اور جمہوریت پر رکھی گئی ہے کیا یہ بنیاد اب کم زور

ہوتی جارہی ہے اوراس کے منہدم ہونے کا خطرہ لاحق ہے؟ یہاں کی اخلاقی اقدار میں بقائے باہم اور رواداری بہت نمایاں سمجھی جاتی تھی، کیا اب یہ قدریں باقی نہیں رہیں اور ماضی کی داستان بن گئیں؟ ملک کی بقا و سالمیت، اتحاد اور یک جہتی کا جو نقشہ یہاں کے قومی راہنماؤں نے اپنے سامنے رکھا تھا، کیا اب وہ بدل رہا ہے اور اس سے مختلف کوئی دوسرا نقشہ ابھر رہا ہے؟ جس ملک کو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، کیا اب وہ باہم مل کر یہاں رہ سکیں گے اور انہیں فطری انداز میں پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل رہیں گے یا یہاں صرف ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک خاص ذہن وفکر کو باقی رہنے کا حق ملے گا؟

ان ہنگاموں میں سب سے زیادہ مسلمان متاثر ہوئے۔ وہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود سوچنے پر مجبور ہیں کہ بابری مسجد کا شہید ہونا ایک اتفاقی واقعہ یا جذباتی اور وقتی حادثہ ہے یا اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور گہری سازش ہے؟ عبادت گاہ تو دنیا کی سب سے محفوظ جگہ سمجھی جاتی ہے، اس کا احترام ہر شخص کرتا ہے، چاہے وہ کسی بھی فرقہ اور گروہ کی عبادت گاہ ہو۔ جب وہ محفوظ نہیں رہی تو پھر کون سی چیز محفوظ رہ سکتی ہے؟ کیا ان کی جان، مال، عزت وآبرو اور مذہب وتہذیب کسی بڑے خطرہ سے دوچار ہے؟ ملک میں ان کے باعزت زندگی گزارنے کا کیا راستہ ہے؟ کیا اب مایوسی اور اندھیرا ہی ہے یا امید کی کوئی کرن بھی ہے؟

حالات ہزار خراب سہی، لیکن مایوسی اور ناامیدی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ قوموں پر نازک سے نازک وقت آتا ہے اور کبھی بدترین حالات سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ اسی میں ان کا امتحان ہے۔ جو قوم حالات کو ناسازگار اور ماحول کو ناموافق دیکھ کر نہ گھبرائے، مایوس نہ ہو، ہمت نہ ہارے، ہوش وحواس باقی رکھے، حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور استقامت اور پامردی کا ثبوت فراہم کرے، وہ کامیاب وکامران ہوکر ابھرتی ہے اور اپنا مقام آپ پیدا کرلیتی ہے۔ اس کے برخلاف حالات کی سنگینی جس قوم کو مضمحل اور ناتواں کردے اور ہر چھوٹی بڑی آزمائش کو اپنے لیے موت کا پیغام سمجھ بیٹھے، اسے دنیا کی کوئی طاقت زندگی اور توانائی نہیں فراہم کرسکتی وہ خود بخود ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ جو

قوم اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھتی ہو وہ کبھی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوسکتی۔اس لیے کہ سب سے بڑی قوت اسی کی ہے، اس سے بڑی کوئی قوت نہیں ہے۔ ساری قوتوں کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔ وہ جب چاہے، ظلمتِ شب کو نورِ سحر میں تبدیل کرسکتا ہے اور موت کے سایوں میں زندگی کے آثار پیدا کرنا اس کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ حالات اگر تاریک ہیں تو اس کے حکم سے روشن اور تابناک بھی ہوسکتے ہیں، لیکن یہ کرشمے اس وقت ظاہر ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتے ہیں جو ایمان وعمل کی دولت سے مالامال ہوں، جو صرف ایک اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوں، جو ہر حال میں اس کے دامن سے چمٹے رہیں، جو اس کے سوا کسی اور سے کوئی توقع نہ رکھیں اور اسی کو اپنا آخری ملجا و ماویٰ تصور کریں۔

اس کے ساتھ ہمیں ملک کے موجودہ حالات اور اس کی فضا کو بدلنے کی کوشش بھی کرنی ہوگی۔ حالات کے بگاڑ کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر ہم سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ اس میں ہماری مدت دراز کی غفلت اور کوتاہی کا بڑا دخل ہے۔ ان میں تبدیلی لانے کے لیے بھی طویل جدوجہد کرنی ہوگی۔ کوئی مختصر راستہ اس طویل جدوجہد کا بدل نہیں ہے۔

سب سے پہلے باشندگانِ ملک کے سامنے ہمارے صحیح تعارف کی ضرورت ہے۔ ہمارا تعارف ایک ایسی قوم کی حیثیت سے نہ ہو جس کا کوئی متعین نصب العین نہیں، کوئی خاص طریقۂ حیات اور خاص تہذیب و معاشرت نہیں، بلکہ بعض تاریخی عوامل اور کچھ رسوم و روایات نے اسے ایک قوم بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس اس کا تعارف ایک ایسی امت کی حیثیت سے ہو جو متعین اصول ونظریات کی مالک ہے، جنہیں وہ حق وصداقت پر مبنی اور اپنے لیے اور ساری دنیا کے لیے فلاح ونجات کا ذریعہ تصور کرتی ہے۔ وہ مخصوص طرز فکر اور تصور حیات رکھتی ہے جو اسے جان، مال اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، جس سے وہ کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک ایسی امت ہے جو اخلاقی اقدار کی حامل ہے جو اس کے نزدیک قابلِ احترام ہیں۔ اس کی تہذیب، معاشرت، سیاست ہر چیز کے پیچھے ارفع واعلیٰ اور بہت ہی پاکیزہ تصورات کارفرما ہیں۔

اس تعارف پر اگر طنز وتعریض کی جاتی ہے، قدامت پرستی اور دقیانوسیت کا طعنہ دیا

جاتا ہے، عہدِ جدید کے تقاضوں سے بے خبری کا الزام عائد ہوتا ہے تو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا جائے، اس پر مطمئن کرنے کی جو بھی معقول کوشش ہوسکتی ہے کی جائے اور حکمت و دانائی کے ساتھ جو اعتراضات ہوں انہیں رفع کرنے کی اور جو شبہات ہوں ان کے ازالہ کی تدبیر کی جائے۔

جن اعلیٰ اصول اور اقدارِ حیات پر ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں انہیں ہماری زندگیوں میں جلوہ گر ہونا چاہیے۔ ہماری سیرت ان کی ترجمان ہو، ہمارے اعمال اُن کی گواہی دیں، ہمارے اخلاق سے ان کا ثبوت ملے، ہمارے معاملات ان کی تصدیق کریں اور ہمارے تعلقات سے ان کی ضوفشانی ہوتی رہے۔ ہم میں سے ہر فرد بیوی بچوں اور اہل خاندان کے حقوق پہچانے، وہ کسی کا پڑوسی ہوتو بہتر پڑوسی ہو، تاجر ہوتو امانت دار تاجر ہو، ملازم ہوتو فرض شناس ملازم ہو، مالک ہوتو ماتحتوں کے حقوق بخوشی ادا کرے، اس کی ذات سے نہ کسی کو اندیشہ ہو اور نہ کوئی خطرہ محسوس کرے۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والا اور ان کے رنج و راحت میں شریک رہے۔ دنیا کو یہ ثبوت ملے اور مسلسل ملتا چلا جائے کہ مسلمان رنج و راحت، دشواری اور آسانی، کسی حال میں اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ماحول پرامن ہو یا چاروں طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک رہے ہوں، وہ اسلام کے قائم کردہ حدود کو پامال نہیں کرسکتا۔ فسادات میں جب معصوم اور بے گناہ مارے جاتے ہیں، عصمتیں لٹتی ہیں، املاک اور جائداد نذرِ آتش ہوتی ہے، اس وقت بھی وہ دوسروں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس طرح وہ جہاں رہے اور جس حال میں رہے، اسلام کی تعلیم کا پابند رہے اور اس کے ذریعہ دنیا کو اسلام کا درس ملتا رہے۔

اس امت کو خیرِ امت کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے لیے اپنے پاس خیر و فلاح کا پیغام رکھتی ہے۔ اس پیغام کو عام ہونا چاہیے۔ اس ملک کے سامنے یہ بات آنی چاہیے اور پورے زور اور قوت کے ساتھ آنی چاہیے کہ مسلمان اس ملک کے خیر خواہ ہیں اور خدا پرستی کی بنیاد پر اس کی تعمیر و ترقی چاہتے ہیں۔ مختلف طبقات اور گروہوں کے درمیان تصادم کو وہ غلط اور ناروا تصور کرتے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد

اور یگانگت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی کے حلیف یا کسی کے حریف نہیں ہیں بلکہ سب انسانوں کو ایک خدا کی مخلوق جانتے ہیں اور ان کی بھلائی کا پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ اس ملک کے سامنے ظلم و زیادتی کو ختم کرنے والے اور عدل وانصاف کے علم بردار کی حیثیت سے آئیں، یہاں کی طبقاتی اور گروہی کشمکش کو ختم کریں، کم زور طبقات کو طاقت ور طبقات کے جور وستم سے بچائیں اور وحدت انسانیت کا درس دیں۔

قرآن مجید نے اختلاف وانتشار سے منع کیا اور کہا کہ اس سے تم کم زور ہوجاؤ گے اور تمہارے قدم اکھڑ جائیں گے۔ آج اسی صورتِ حال سے ہم دو چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو بعض بنیادی عقائد اور نظریات کے تحت متحد و منظّم کیا تھا اور وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ابھری تھی۔ مخالف طاقتیں اس سے ٹکراتیں لیکن اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈال سکتی تھیں، لیکن اتحاد پیدا کرنے والے یہ عقائد اور نظریات ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل نے ہماری صفوں میں بڑے بڑے شگاف ڈال دیئے ہیں اور ہم ایک دوسرے سے دست بہ گریباں ہیں۔ بعض مسائل میں اختلاف فطری ہے، وہ اختلاف موجود ہے اور رہے گا لیکن ان میں زیادہ تر مسائل کی نوعیت جزئی اور فروعی ہے۔ لیکن مختلف اسباب کی بنا پر یہی مسائل ہمارے درمیان پھوٹ کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ اس صورت حال کو ختم ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کو ہم فراموش نہیں کرسکتے کہ اس امت کا نفع و ضرر اور سود و زیاں ایک ہے۔ اس پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو کسی کا مسلک معلوم کرکے نہیں آتی بلکہ امت کے فرد کی حیثیت سے آتی ہے۔ یہ امت اگر ابھرے گی بھی تو امت مسلمہ ہی کی حیثیت سے ابھرے گی۔ اس ملک میں ہمارے موجودہ مسائل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بارہ کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہماری کوئی ایک آواز نہیں ہے۔ ہماری ایک آواز ہوتی تو شاید ہمارے مسائل اتنے پیچیدہ نہ ہوتے۔

اس وقت سب سے اہم اور فوری مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقات کے درمیان نفرت، تعصب اور تنگ نظری کی جو فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس کا بھرپور مقابلہ کیا جائے، امن وامان بحال ہو، قانون کی حکم رانی ہو، عدل وانصاف ہو، ہر شخص کو برابر کے حقوق حاصل ہوں، ترقی کی راہیں سب کے لئے کھلی رہیں اور ہر ایک کو

اپنی صلاحیت کے مطابق ملک و قوم کی خدمت کے مواقع حاصل ہوں۔ جو اختلافات ہوں انہیں سنجیدہ اور پرسکون ماحول میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کسی ایک فرد یا گروہ کی نہیں بلکہ پورے ملک کی ضرورت ہے۔ یہ اس ملک کی اندرونی آواز ہے جسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وسیع وعریض ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو یہاں کی فضا کو مکدر کرنا چاہتا ہے اور کررہا ہے۔ ہنگاموں کو ہوا دیتا اور اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس طبقہ کا کوئی دین، دھرم یا کوئی اخلاق نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو ناپاک مقاصد ہیں ان سے دنیا واقف ہے۔ اس طبقہ کے افراد ہر جگہ اور ہر قوم میں مل جائیں گے۔ اس ملک کی بہت بڑی آبادی امن و امان اور سکون چاہتی ہے، اس کے پاس ان ہنگاموں کے لیے فرصت ہے اور نہ یہ اس کا مزاج ہے۔ اس کی کم زوری یہ ہے کہ ان نازک حالات میں خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ اس کے اندر حق کو حق اور ناحق کو ناحق کہنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ ایسے افراد کی پہلے بھی کمی نہیں تھی اور موجودہ ہنگاموں کے بعد تو ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے، جنھوں نے حالیہ فسادات اور ہنگاموں پر اپنی ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، جو لوگ ان میں پیش پیش رہے ہیں، ان کے ناپاک عزائم کو واضح کیا ہے اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ انہیں اس بات پر افسوس اور صدمہ ہے کہ ان ہنگاموں سے ہماری تصویر بگڑی ہے اور بدنامی اور رسوائی ہوئی ہے۔ ان میں سیاسی افراد بھی ہیں، دانشور اور مفکر بھی ہیں، سماجی کارکن بھی ہیں اور صحافت سے تعلق رکھنے والے تو اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سیاسی جماعتوں نے بھی اس پر اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس احساس کو تقویت پہنچائی جائے اور ان کے ساتھ مل کر امن و امان اور عدل و انصاف کی فضا بحال کی جائے اور یہ حقیقت پوری قوت کے ساتھ واضح کی جائے کہ اس ملک کی سالمیت، اتحاد اور ترقی کے لیے امن و امان کا قائم رہنا ضروری ہے۔ اس کے لیے سوچا سمجھا کوئی منصوبہ اور لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد کے ہنگاموں کے بعد حکومت نے ۱۰؍دسمبر

۱۹۹۲ء کو ملک کی پانچ پارٹیوں پر پابندی لگادی۔ یہ پابندی غیر قانونی سرگرمیوں کے انسداد سے متعلق قانون کے تحت ہے۔ جن پارٹیوں پر اس قانون کے تحت پابند لگائی گئی ہے ان میں جماعت اسلامی ہند بھی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کی سرگرمیاں بند ہوچکی ہیں۔ جماعت کے ذمہ دار اور متوسلین ہی نہیں بلکہ جولوگ جماعت سے براہ راست واقف ہیں، وہ سب ہی حکومت کے اس اقدام سے حیرت زدہ ہیں۔ اس لئے کہ جماعت کے دستور، اس کی پالیسی، اس کے طریقۂ کار اور اس کی پینتالس سالہ تاریخ میں سے کوئی چیز اس اقدام کے جواز میں نہیں پیش کی جاسکتی۔

جماعت اسلامی، مسلمانوں میں اسلام کی تعلیم کو عام کرتی اور انہیں اس کی پاکیزہ تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ ملک کے دوسرے باشندوں کے سامنے بھی اسلام کا صحیح تعارف کراتی اور اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کے ازالہ کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ساری کوششیں اسلامی ہدایات کے تابع اور دستور ہند کے دئے ہوئے حقوق کے اندر ہیں۔ جماعت کے دستور اور اس کی پالیسی میں پوری صراحت ہے کہ جماعت اپنے تمام کاموں میں آئینی اور اخلاقی طریقے اختیار کرے گی۔ چناں چہ اس کی پالیسی میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

> ”جماعت اسلامی ہند اپنے نصب العین کے حصول کے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول کی پابند ہے اور ان ہی کی ہدایات کے تحت اخلاقی، تعمیری، پرامن، جمہوری اور آئینی طریقے اختیار کرتی اور ایسی تمام باتوں سے اجتناب کرتی ہے جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کشمکش اور فساد فی الارض رونما ہوسکتا ہو۔“

جماعت اسلامی کی یہ پالیسی اس کے ہر چہار سالہ پروگرام کے آغاز میں چھپتی ہے اور دستیاب ہے۔ مختلف فرقوں کے درمیان نفرت اور تعصب کا پیدا کرنا اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کرنا اور لڑانا، اسلام کی تعلیمات کے صریح خلاف ہے۔ جماعت اسلامی اپنے عقیدہ اور نظریہ کے لحاظ سے اسلام کی ان تعلیمات کی پابند ہے۔ وہ اس کے خلاف جانہیں سکتی۔ اس کا تصور یہ ہے کہ سارے انسان ایک وحدت ہیں اور ان

کے درمیان مساوات اور برابری کا معاملہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے وہ سنجیدہ کوشش کرتی رہی ہے۔اس وقت ملک کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اور ان کے درمیان افہام و تفہیم کا ماحول پیدا ہو، جماعت اسلامی زیادہ بہتر طریقہ سے یہ خدمت انجام دے سکتی تھی۔ اسی طرح جماعت کا ریکارڈ ہے کہ اس نے جہالت کو دور کرنے اور تعلیم کو عام کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، انسانوں کی خدمت، وقت ضرورت مصیبت زدوں کے ساتھ تعاون اور فساد کے مواقع پر امدادی کاموں میں پیش پیش رہی ہے۔ اس وقت ملکی تعمیر میں اس کی خدمات کی زیادہ ضرورت تھی۔ افسوس کہ حکومت کے ایک غلط اقدام نے ملک وملت کو اس کی خدمات سے محروم کر دیا ہے۔

جماعت پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک الزام یہ ہے کہ امیر جماعت مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے ۲۷؍مئی ۱۹۹۰ء کی ایک تقریر میں فرمایا کہ کشمیر ہندوستان سے الگ ہوکر رہے گا۔ اسی طرح مولانا عبدالعزیز صاحب نائب امیر جماعت پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے یکم اگست ۱۹۹۱ء کی ایک تقریر میں رائے شماری کو مسئلہ کا حل بتایا۔ ان دونوں ذمہ داروں نے اپنے حلفیہ بیانات میں اس کی تردید کی ہے۔ کشمیر کے مسئلہ میں جماعت کی شوریٰ کی قرار دادیں اور اس کے ذمہ داروں کے واضح بیانات موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں کوئی شخص یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا کہ جماعت نے کشمیر کی ہندوستان سے علیحدگی کی بات کہی۔ اس نے ہمیشہ پرامن ماحول میں کشمیریوں سے مذاکرات اور بات چیت پر زور دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت ان سب باتوں سے واقف ہے لیکن یہ اس کی ایک سیاسی مجبوری تھی کہ جب اس نے غیر مسلم تنظیموں پر پابندی عائد کی تو مسلمان تنظیموں پر پابندی عائد کرے۔ ورنہ غیر مسلم اس سے ناخوش ہوتے اور ان کے ووٹ حاصل کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو محض توازن کی خاطر کسی تنظیم پر پابندی عائد کرنا حق و انصاف کو پامال کرنا ہے اور محض الیکشن میں ووٹ کی خاطر ایک بہترین قوت کو ضائع کرنا ملک کے ساتھ بہت بڑی بدخواہی ہے۔ (سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۹۳ء)

ملک کے موجودہ حالات

(تبدیلی جمہوریت کی راہ سے آنی چاہئے)

آج ہمارا ملک — ہندستان — زبردست انتشار اور افتراق کی زد میں ہے۔ ہر طرف نفرت و عداوت ہے، اضطراب اور بے چینی ہے، شکست و ریخت اور توڑ پھوڑ ہے۔ یہاں پھوٹ ڈالنے اور افتراق پیدا کرنے والے عناصر تو اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں لیکن اسے متحد رکھنے اور اس کے مختلف طبقات کو باہم جوڑنے والی کوئی مضبوط اساس سامنے نہیں آرہی ہے۔ لے دے کے ایک قومیت کا جذبہ ہے جس سے یہاں کے سوچنے سمجھنے والے افراد توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں، لیکن وہ دن بدن کم زور سے کم زور ہوتا جارہا ہے۔

جو لوگ اسلام پر ایمان و یقین رکھتے ہیں اور اسے ایک انقلابی فکر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک اسلام اس ملک کے اتحاد اور اس کی ترقی کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے اندر مختلف طبقات اور گروہوں کو ایک وحدت بنانے کی صلاحیت ہے۔ مسلمانوں کے موجودہ اختلافات اور ان کا انتشار فکر و عمل اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسلام اپنی صلاحیت کھو چکا ہے، اس لئے کہ اس انتشار کے اسباب اسلام کے اندر نہیں، باہر ہیں۔ اسلام سے دوری نے مسلمانوں کو یہ روزِ بد دیکھنے پر مجبور کیا ہے۔ ماضی میں وہ مختلف گروہوں اور نسلوں اور برسرپیکار طبقات کو جوڑنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا کارنامہ انجام دے چکا ہے اس لیے مستقبل میں اس سے اس کی توقع بے جا نہ ہوگی۔

اسلام کو اس ملک میں ایک متبادل فکر کی حیثیت سے پیش کرنے والوں کو یہاں

کے مذہبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات کو پوری طرح سامنے رکھنا ہوگا تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی راہ عمل کا تعین کرسکیں۔ ہمارا ملک اس وقت بڑے پیچیدہ حالات اور گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ یہ حالات و مسائل وقتی نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ وہ ان حالات سے نکلنا چاہتا ہے لیکن نکل نہیں پارہا ہے اور ملکی راہنماؤں کی بے تدبیریوں کے نتیجہ میں مسائل کی فہرست میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ ان پیچیدہ حالات میں مختلف پہلوؤں سے طویل جدوجہد کرنی ہوگی اور ہر گوشۂ حیات میں اسلام کی ہدایات سے روشناس کرانا اور ان کی حقانیت اور افادیت ثابت کرنی ہوگی۔ یہ کام بڑا مشکل اور صبر آزما بھی ہے اور بڑی دیدہ وری بھی چاہتا ہے۔ اسلام کے داعیوں اور خدمت گاروں کو ان ہی حالات میں راہیں تلاش کرنی ہوں گی۔ ذیل میں ملکی حالات کا تھوڑا سا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس بڑے ملک کے کتنے مسائل ہیں۔ ہمارے کام کے کتنے گوشے ہیں اور ان کے سلسلہ میں کیا دشواریاں ہیں؟ ان حالات میں ہماری کیا حکمت عملی ہونی چاہئے؟

۱- ہندستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ شمال سے جنوب کے آخری سرے تک اس کی لمبائی 3214 کلومیٹر اور مشرق سے مغرب تک اس کی چوڑائی 2933 کلومیٹر ہے۔ یہ ملک 3287263 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے، اس میں پچیس ریاستیں یا صوبے اور مرکز کے تحت چھ علاقے ہیں۔

۲- آبادی کا حال یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 843930861 نفوس پر مشتمل تھی۔ اب یہ آبادی بڑھ کر 90 کروڑ سے بھی آگے نکل رہی ہے۔ ہوسکتا ہے آئندہ مردم شماری میں یہ ایک ارب تک پہنچ جائے بلکہ اس سے آگے نکل جائے۔

۳- اس ملک کا کوئی ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ ہندومت، اسلام، عیسائیت، سکھ مت، بدھ مت، جین مت جیسے بڑے بڑے مذاہب یہاں موجود ہیں۔ یہودیت اور زرتشت کے ماننے والے آتش پرست بھی تھوڑی بہت تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں وہ لوگ بھی ہیں جو کسی مذہب کے قائل نہیں ہیں جنہیں آپ ملحد یا دہریے بھی کہہ سکتے

ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خود کو انسان دوست Humanists کہتے ہیں۔

۴- یہاں کی چوراسی فیصد آبادی ہندومت کی ماننے والی ہے، لیکن یہ مختلف طبقات اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، جن کے درمیان عقیدے اور فکر کا بنیادی اختلاف ہے۔ ہندومت کے دائرہ میں پس ماندہ طبقات اور قبائل، آدی باسی اور اسی نوعیت کے دیگر قبائل کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے۔ ان کی آبادی کل آبادی کا 23.91 فی صد ہے۔ ان سب کے رسوم و رواج اور طریقہ ہائے حیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن یہ سب ہندو ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ہندومت کے بعد یہاں کا سب سے بڑا مذہب اسلام ہے، جس کے ماننے والوں کی تعداد 12 تا 15 فی صد ہے۔ یہاں کے بڑے مذاہب کے درمیان، عقیدے، عبادات اور معاشرت وتہذیب کے اس قدر بنیادی اختلافات ہیں کہ ایک کو صحیح مانا جائے تو دوسرے کو غلط کہنا ہوگا، اس وجہ سے ان سب کو ایک دوسرے میں ضم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک کو چھوڑے بغیر دوسرے کو اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔

۵- ہمارے ملک کو ایک مذہبی ملک کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات اس پہلو سے صحیح ہے کہ یہاں فی الجملہ مذہب اور روحانیت کا تصور عام ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ بھی ہے، اسے دبانے کی ہزار کوشش کے باوجود وہ بار بار ابھرتا رہتا ہے۔ لیکن ایک بڑا سوال جس سے ملک دوچار ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اور روحانیت کا معاملاتِ حیات اور دنیا کے نظام سے کیا تعلق ہے؟ اس سے ہر آن رواں دواں دنیا کے پیچیدہ اور آج کی دنیا کے پیچیدہ تر مسائل کیسے حل ہوں گے؟ مذہب کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ اس نے ترکِ دنیا کی تعلیم دی ہے اور دنیوی امور سے بے تعلقی کا رجحان پیدا کیا ہے۔ اسی کو مذہب کی معراج سمجھا جاتا ہے، اس لیے مذہبی جذبات کے باوجود مذہب سے دوری بڑھتی جارہی ہے۔ اس کی ضرورت اور افادیت کو ملک اور اہل ملک تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

اسی طرح ملک میں اخلاق کی اہمیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس کی تعلیم وتلقین بھی ہوتی رہتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہورہی ہیں اور کسی جانب سے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا ہے کہ انسان کو اخلاق کا اور اخلاقی قدروں کا کیسے پابند بنایا جائے اور اسے بے راہ روی سے بچایا جائے؟

۶- ملک میں ہندی کو رابطے کی زبان (Link Language) کا درجہ حاصل ہے لیکن بیشتر ریاستوں کی الگ الگ سرکاری زبانیں ہیں، جن میں سے ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ دستور ہند نے اس طرح کی اٹھارہ زبانوں کو تسلیم کیا ہے۔ ان میں بعض زبانیں اپنی قدامت، علمی سرمایے، لسانی خصوصیات اور ان کے بولنے والوں کی کثرت تعداد کی بنا پر خود کو ہندی سے فائق اور برتر سمجھتی ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہندی سے شکایت ہے کہ وہ ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے اور اس وجہ سے ان کی اہمیت کم ہورہی ہے۔ بعض ریاستیں باہم رابطے کے لیے انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک انگریزی ہی کو استعمال کرتی چلی آرہی ہیں، ان کی مجبوریاں ہوسکتی ہیں لیکن بہرحال انھوں نے ہندی کو رابطہ کی زبان کی حیثیت سے عملاً قبول نہیں کیا ہے۔ ہندی مخالف جذبات کے نتیجہ میں یہاں لسانی ہنگامے اور پرتشدد مظاہرے بھی ہوتے رہے ہیں۔ اسی کے بطن سے ایک وقت میں انڈین یونین سے علاحدگی کا مطالبہ بھی ابھرا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ دستور کی تسلیم شدہ تمام زبانوں کو رابطے کے لئے استعمال کیا جائے اور آہستہ آہستہ جس زبان کو قبولیت عام کا درجہ مل جائے، اسے رابطے کی مشترک زبان مان لیا جائے۔ ان بڑی بڑی زبانوں کے علاوہ ملک میں بہت سی بولیاں ہیں جو خاص خاص علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ بالعموم کوئی دوسری زبان نہیں جانتے۔ اب یہ بولیاں بھی ترقی کررہی ہیں اور اپنا حق مانگ رہی ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی بڑی بولیوں کی تعداد سولہ سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

۷- پورے ملک میں خاصا جغرافیائی فرق پایا جاتا ہے۔ ہر خطے کی آب و ہوا اور موسم دوسرے سے جدا ہے، اس کی وجہ سے رنگ روپ، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں ہی نہیں تہذیب و معاشرت میں بھی کافی اختلاف ہے۔ ہر خطے میں پیدائش، موت، شادی بیاہ، خوشی اور غم کے رسوم و رواج الگ ہیں، یہاں تک کہ پورے ملک کا ایک تہوار نہیں ہے۔ سب کے الگ تہوار ہیں۔ ملک کا کوئی خطہ اپنی تہذیب و معاشرت اور امتیازی خصوصیات سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

۸- انگریزوں کی غلامی سے ملک کی آزادی کے لئے یہاں کے مختلف طبقات

نے متحد ہوکر جدوجہد کی اور زبردست قربانیاں دیں، بالآخر ملک آزاد ہوگیا اور اقتدار اہل ملک کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ ایک وقتی محرک تھا۔ آزادی وطن کے بعد یہ محرک ختم ہوگیا، اب ملک کے مختلف طبقات کو باہم جوڑنے والا اس طرح کا کوئی قومی محرک نہیں ہے، اس لئے وہ اختلافات جو پہلے سے موجود تھے اور وقتی طور پر دب گئے تھے، اب سر اٹھانے لگے ہیں۔

آزادی وطن کے بعد یہاں کے رہ نماؤں کے سامنے دو اہم سوالات تھے۔ ایک یہ کہ یہ ملک دنیا کے غریب ملکوں میں سے ایک ہے۔ یہاں اگر دولت ہے بھی تو اس کی تقسیم غیر متوازن ہے۔ ایک طرف چند دولت مند خاندان ہیں جو دادِ عیش دے رہے ہیں اور دوسری طرف آبادی کا بڑا طبقہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر پا رہا ہے۔ اسے پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کی روٹی اور تن ڈھکنے کے لیے معمولی کپڑا تک میسر نہیں ہے۔ اس تفاوت کو کیسے ختم کیا جائے؟ اور یہاں سب کے لئے معاش کے یکساں مواقع اور سہولتیں کیسے فراہم ہوں؟ اس مقصد کے لئے ملک کے ذمہ داروں نے سوشلزم کی راہ اختیار کی جو ہندستان کی طرح تمام غریب ملکوں کی منزل مقصود تھی اور جسے غربت و افلاس کا واحد علاج اور نسخۂ کیمیا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ کے تجربے اور سوشلزم کے امام، سوویت روس کی شکست و ریخت اور معاشی محاذ پر ناکامی کے بعد ہمارے ملک کو اپنا قبلہ بدلنا پڑا۔ اور اب وہ امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ممالک کی طرف امید بھری اور للچائی نظروں سے اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح اس سے پہلے وہ اشتراکی ملکوں کی طرف دیکھا کرتا تھا۔

۹- جنگ آزادی کے رہ نماؤں اور ملک کے قائدین کے سامنے دوسرا بڑا سوال بلکہ پہلے سے زیادہ اہم سوال یہ رہا ہے کہ یہاں کے مختلف طبقات اور گروہوں کو کیسے متحد رکھا جائے؟ عقیدہ وفکر، دین ومذہب، تہذیب و معاشرت اور زبانوں کے اختلاف اور تنوع کے ساتھ ان کے اندر ایک ہندستانی قوم ہونے کا احساس کیسے پیدا کیا جائے؟ اس کا علاج سیکولرزم اور ڈیموکریسی میں تلاش کیا گیا۔ یہ دونوں فلسفے مغرب سے برآمد کیے گئے اور ان کی بنیاد پر ملک کا آئین وضع کیا گیا۔

مغرب میں سیکولرزم کا تصور مذہب سے کشمکش اور اس سے بغاوت کے نتیجے میں ابھرا۔ اجتماعی زندگی سے وہ بالکل بے دخل کر ہی دیا گیا تھا۔ انفرادی اور شخصی زندگی سے بھی مذہب کی پیدا کردہ روحانیت، پاکیزگی اور اخلاقی قدریں بھی رفتہ رفتہ خارج ہوتی چلی گئیں۔ ہندستان جیسے مذہبی ملک کے لیے یہ چیز قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی اس لیے اس کی تاویل یہ کی گئی کہ ہندستان کا سیکولرزم مذہب کا مخالف نہیں بلکہ مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہے۔ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہ ہوگا اور وہ تمام مذاہب کے ساتھ بالکل مساوی اور برابر کا رویہ اختیار کرے گا ریاست کے نزدیک کسی مذہب کو دوسرے پر ترجیح نہ حاصل ہوگی۔

جمہوریت کا تصور یہ ہے کہ ملک پر کسی فرد، خاندان یا کسی طبقے اور گروہ کی حکومت نہ ہو بلکہ تمام شہریوں کو آزادی اور ترقی کے یکساں مواقع حاصل رہیں۔ باشندگانِ ملک پر ان کے منتخب نمایندوں کی حکومت ہو اور وہ ان کے مفاد کے لیے کام کریں ملک کے باشندوں کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا ہر چند سال بعد موقع ملتا رہے۔

ان دو بنیادوں پر جو دستور وضع کیا گیا اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہے، انسان کے فکر و عمل میں خامیوں کا پایا جانا بالکل فطری ہے چنانچہ اس بات کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ دستور میں اب تک چھوٹی بڑی چوراسی (۸۴) تبدیلیاں ہوچکی ہیں اور آیندہ بھی اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے اس پر اصولی اعتراض یہ ہے کہ اس میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا ہے کہ انسان پر انسان کی حکم رانی غلط اور ناجائز ہے۔ کسی فرد کو، چاہے وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو، اسی طرح کسی چھوٹے بڑے گروہ کو خواہ وہ اقلیت سے تعلق رکھتا ہو یا اکثریت سے، انسانوں پر حکومت کا حق نہیں ہے۔ یہ حق صرف خدائے تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے جو تمام انسانوں کا خالق، مالک، پروردگار، معبود اور فرماں روائے مطلق ہے، وہی انسانوں کو قانون دینے کا مجاز ہے۔ اسی کا قانون ہر نقص اور عیب سے پاک ہوسکتا ہے اور پاک ہے۔ دستور سے اصولی اختلافات بعض اور لوگوں کو بھی ہوسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود باشندگان ملک نے اور ان کے سب ہی

طبقات نے اس دستور کو ملک کے موجودہ حالات میں ایک موزوں اور مناسب دستور کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ دستور ہند کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہر ایک کے نزدیک قابل قدر ہیں اور ان میں سبھی کے جذبات اور امنگوں کی بڑی حد تک رعایت پائی جاتی ہے۔

۱- دستور ہر شہری کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا اور کسی بھی شہری کے ساتھ کسی قسم کے امتیاز کو روا نہیں رکھتا۔

۲- دستور نے مذہب کی آزادی فراہم کی ہے۔ اس آزادی کا دائرہ گو بہت محدود ہے لیکن اس کے تحت ہر شخص اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرسکتا ہے، پیدائش، موت، شادی بیاہ اور خوشی و غم کے مواقع پر مذہبی مراسم انجام دے سکتا ہے۔ ہر مذہبی گروہ کو اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اس کا پرسنل لا محفوظ رہے گا اور اس کی مذہبی روایات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ مختلف قبائل اور پہاڑی آبادیوں کو بھی جن کا پرسنل لا تحریری شکل میں مرتب اور مدون نہیں ہے اور جو اپنی قدیم روایات کے پابند ہیں، اس حق سے محروم نہیں کیا گیا ہے۔

۳- مذہبی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کی تعلیم و تربیت، اس کی نشر و اشاعت، مذہبی اداروں کے قیام اور اس کی دعوت و تبلیغ کا حق ہے۔ مذہب کی تبلیغ کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہاں تبدیلیٔ مذہب کے حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ملک کا جو شہری جس مذہب کو قبول کرنا چاہے قبول کرسکتا ہے اس پر از روئے دستور کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں اگر تبدیلیٔ مذہب کے پیچھے جبر و اکراہ، خوف اور لالچ، مکر و فریب جیسی چیزیں کار فرما ہوں تو قانون اسے کالعدم بھی کرسکتا ہے۔

۴- دستور ہند فکر و عمل کی، اظہار خیال کی، انجمن سازی اور جماعت بنانے کی آزادی فراہم کرتا ہے۔ یہاں ہر شہری کو اس کا حق ہے کہ وہ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے جس نظریے کو صحیح سمجھے اس کی طرف دعوت دے اور اس کے لیے منظم جدو جہد کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا موجودہ اجتماعی اور سیاسی نظام بالکل آخری اور حتمی نہیں ہے، اس کا بدل تلاش کیا جاسکتا ہے اور اسے ملک کے سامنے پیش کرنے میں بھی

کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اگر اہل ملک موجودہ اجتماعی نظام کے مقابلہ میں کسی دوسرے نظام کو قبول کرلیں تو وہ اس کی جگہ لے سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کے بعض طبقات کو یہ شکایت رہی ہے کہ دستور کے بعض بنیادی حقوق عملاً اسے حاصل نہیں ہیں اور ان کی راہ میں کئی طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ لیکن یہ رکاوٹیں عمل درآمد کی ہیں۔ اس کے پیچھے خاص قسم کے تعصّبات، جذبات اور نفسیاتی عوامل کام کررہے ہیں۔ یہ دستور کا قصور نہیں بلکہ ان افراد یا جماعتوں کا قصور ہے جو اپنے ذاتی مصالح کے تحت اسے پوری طرح عمل میں آنے نہیں دیتے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس ملک میں ایسی طاقتیں پہلے بھی رہی ہیں اور آج بھی موجود ہیں، جو دستور ہند اور اس کے جمہوری مزاج سے ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتیں۔ وہ ملک میں کھلی اور آزاد فضا کو گوارا نہیں کررہی ہیں اور یہاں کے مذہبی، معاشرتی، تہذیبی اور لسانی تنوع کو بہ جبر ختم کرکے اسے ایک خاص تہذیب میں بدل دینا چاہتی ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ اس ملک کے نقشے میں پائے جانے والے کئی رنگوں کو مٹاکر اسے یک رنگ کردیا جائے۔ اس کے لئے وہ اگر اپنے پسندیدہ کلچر اور تہذیب کی خوبیاں واضح کریں اس کی برتری دلائل سے ثابت کریں اور اسے اختیار کرنے کی دعوت دیں تو جمہوری روایات کے تحت یہ غلط نہ ہوگا۔ اس کا حق ہر تہذیبی اکائی کو از روئے دستور حاصل ہے، لیکن تشویش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زور اور قوت کا استعمال کرتی نظر آتی ہیں اور دستور کے ڈھانچے ہی کو بدل دینے کا عزم وارادہ رکھتی ہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ملک میں جو بھی تبدیلی آئے وہ باشندگانِ ملک اور اس کے مختلف طبقات کی آزاد مرضی سے آئے۔ اس معاملہ میں جبر اور زور زبردستی کا رویہ ملک کے اتحاد اور امن وامان کو ختم کردے گا اور پورا ملک انتشار اور بدامنی کی نذر ہوجائے گا۔

جماعت اسلامی ہند اسلام کو اس ملک کے لیے بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے فلاح اور کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے اور خدا کی نازل کردہ ہدایت اور اس کے دیے ہوئے قانون کو صحیح اور برحق قانون تسلیم کرتی ہے۔ اسلام مادّیت اور روحانیت کا بہترین امتزاج

رکھتا ہے اور عدل وانصاف کی ٹھوس بنیادیں فراہم کرتا ہے، اس سے اس ملک کی امنگوں کی تکمیل ہوسکتی ہے، وہ اتحاد واتفاق کی دولت سے ہم کنار ہوسکتا ہے، صحیح سمت میں اس کی ترقی ہوسکتی ہے اور اس پر کامیابی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اس کے حق میں جماعت کے پاس دلائل ہیں لیکن اس کی یہ آواز بہت کمزور ہے۔ ملک کے تمام طبقات تک یہ ابھی نہیں پہنچ پائی ہے۔ اور اگر پہنچی بھی ہے تو اسے اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی راہ میں صدیوں کے تعصب اور نفرت کی دیواریں حائل ہیں۔ جمہوریت اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہے کہ اسلام کو اس کی صحیح شکل میں ملک کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کے بارے میں جو شکوک وشبہات اور تعصّبات پائے جاتے ہیں، انہیں حکمت کے ساتھ دور کیا جائے۔ اس کی تعلیمات کی معقول اور مدلّل تشریح کی جائے، زندگی کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کے نظامِ حیات کی خوبی اور برتری ثابت کی جائے تاکہ باشندگانِ ملک اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرسکیں اور اگر اس میں اپنے دکھ درد کا مداوا اور ملک کی فلاح و بہبود کا سامان دیکھیں تو اسے اختیار کرنے کی راہ میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔ اس عظیم مقصد کے لیے جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ ملک میں جمہوری فضا پوری طرح باقی رہے اور غیر جمہوری، آمرانہ اور فسطائی رجحانات اس کی جگہ نہ لینے پائیں۔

ماہنامہ ''زندگی نو''، نئی دہلی۔ مئی ۱۹۹۷ء

ہندستان کا قدیم طبقاتی نظام

ہندستان صدیوں سے چار مختلف طبقات میں منقسم رہا ہے۔ یہ طبقات ہیں: برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ ویدوں کے مطابق برہما (خالق) کے مونھ سے برہمن وجود میں آئے، ہاتھ سے چھتری، ران سے ویش اور پیر سے شودر پیدا ہوئے۔ اسی لحاظ سے ان کے کام اور سماج میں ان کا مقام متعین ہوا۔ برہمنوں کو دینی قیادت ملی، سماج میں ان کا مقام سب سے اونچا تھا۔ ملک کی حفاظت اور اس پر حکومت کی ذمہ داری چھتریوں کو سونپی گئی۔ برہمنوں کے بعد ان ہی کا درجہ تھا۔ ویش کی سماجی حیثیت ان دونوں کے بعد تھی۔ ان کا کام زراعت، کھیتی باڑی اور تجارت تھا۔ شودر ان سب کی خدمت اور غلامی کے لئے مخصوص کئے گئے۔ یہ سب سے نچلی سطح کے تھے۔ طبقات کی یہ تقسیم خدائی تقسیم مان لی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح انسان کے مختلف اعضاء اپنی جگہ کام کرتے ہیں تو زندگی کی گاڑی سکون سے چلتی ہے اور جب اس میں خلل واقع ہوتا ہے تو زندگی بھی سکون سے محروم ہوجاتی ہے اسی طرح قدرت نے معاشرہ کے مختلف طبقات کو مختلف کاموں کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ سب مل کر اس کی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ لیکن یہ فلسفہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اس لئے کہ قدرت نے انسان یا حیوان کے جس عضو کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے وہی کام وہ کرسکتا ہے کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا۔ آنکھ دیکھ سکتی ہے، اس سے سننے یا بولنے کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اسی طرح ہاتھ چھونے اور پکڑنے اور پیر چلنے کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ بولنے یا دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ اس لئے ان سے یہ خدمت نہیں لی جاسکتی لیکن انسان مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، اسے کسی متعین

کام کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ اسے اس کی فطری صلاحیت کے لحاظ سے کام کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اسی سے وہ ذاتی طور پر ترقی کرسکتا اور معاشرہ کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اس طبقاتی نظام میں کاموں کی تقسیم، صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد نسل (Race) پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک خاص نسل کے افراد ہی مذہبی علم حاصل کریں گے اور مذہبی قیادت ان ہی کو حاصل رہے گی۔ کسی دوسری نسل اور طبقے کے لئے مذہبی علم ممنوع ہوگا اور وہ کبھی مذہبی قیادت نہیں کر سکے گا۔ جس نسل کا تعلق فرمانروائی اور ملک کی حفاظت سے ہے حکومت اور فوج اس کے ہاتھ میں ہوگی، اقتدار اور حکومت کا حق کسی دوسری نسل کو حاصل نہ ہوگا۔ جس نسل کا تعلق زراعت اور کھیتی باڑی سے ہے۔ یہی ہمیشہ اس کا پیشہ ہوگا۔ اس کے لئے کسی اور شعبۂ حیات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح جو نسل غلامی اور چاکری کے لئے مخصوص ہے وہ ہمیشہ اور ہر حال میں یہی کام کرے گی اس حصار سے وہ کبھی باہر نہیں نکل سکتی۔

ان طبقات کو ان کی خدمات اور پیشوں کے لحاظ سے اعلیٰ وادنیٰ میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ برہمن کو سب سے اعلیٰ واشرف سمجھا گیا ہے اس لئے کہ مذہبی قیادت اس کے ہاتھ میں ہے اس کے بعد چھتری اور ویش ہیں۔ سب سے پست طبقہ شودر قرار دیا گیا ہے اور اس کی قسمت غلامی سے وابستہ کردی گئی ہے۔ ان طبقات کو وسائلِ حیات اور ذرائع معاش بھی اعلیٰ وادنی کی تقسیم کے تناسب ہی سے حاصل رہے ہیں۔ جو طبقہ مذہبی قیادت کررہا تھا اسے اس کی تعلیم حاصل کرنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں میسر رہیں۔ مذہبی قیادت اور سیادت وحکمرانی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اس لئے اس طبقے کو بالواسطہ طور پر سیاسی قیادت اور رہنمائی کا منصب بھی حاصل رہا۔ اس لحاظ سے معاشیات پر بھی ان کا قبضہ رہا۔ چھتریوں کو حکمرانی کا پیدائشی حق حاصل تھا اس لئے حکومت کے فوائد اسے حاصل تھے۔ کوئی دوسری نسل نہ تو حکومت کا دعوی کرسکتی تھی اور نہ اس میں شریک ہوسکتی تھی۔ ویش اوپر کے طبقات کے رحم وکرم پر تھے اور ملک کی غذائی ضروریات پوری کرتے تھے۔ شودر ان تمام سہولتوں اور مواقع سے محروم تھے جو ان طبقات

کو حاصل تھے۔ اس کے نتیجہ میں معاشی ہی نہیں معاشرتی پہلو سے بھی پستی اور بلندی کے تصور نے جنم لیا، اعلیٰ طبقہ کے افراد نے پست طبقات کے افراد کو برابر کی حیثیت نہیں دی، نہ معاشرتی تعلقات میں نہ سماجی برتاؤ میں۔ حتیٰ کہ کھانے پینے اور نشست و برخاست میں بھی یہ فرق باقی رہا۔ اس سے آگے بڑھ کر ایک کے پاک اور دوسرے کے نجس اور ناپاک ہونے کا تصور پیدا ہوا اور چھوت چھات او عدم مساوات کے تصور نے معاشرے میں جگہ پکڑلی۔ انسانوں کے درمیان اس تقسیم کو مذہبی سند حاصل رہی اور وہ خدائی تقسیم سمجھ لی گئی اس لئے اسے چیلنج بھی نہیں کیا گیا۔

انسانوں کے درمیان یہ تفریق ظالمانہ اور عقل و فطرت کے صریح خلاف اور ان کی عظمت و شرافت کے سراسر منافی ہے۔ اس کی بنیاد پر جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ عدل وانصاف سے لازماً محروم اور ناانصافی اور بے اعتدالی کا ہمیشہ شکار رہے گا۔ اس فرق و امتیاز کو آج پوری دنیا ظلم سمجھتی ہے اور حقوق انسانی کی تنظیمیں اس کے خلاف آواز اٹھاتی رہتی ہیں لیکن اسے مٹانے میں کامیاب نہیں ہیں۔ ہندوستانی دستور بھی اسے روا نہیں رکھتا اور یہاں کی سیاسی پارٹیاں بھی اسے عدل وانصاف کے منافی تصور کرتی ہیں اور اسے ہر پارٹی اپنا سیاسی ایشو بناتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے نے ابھی اسے پوری طرح قبول نہیں کیا ہے چنانچہ سماجی اور معاشی سطح پر ظلم و ناانصافی اور عدم مساوات کا رویہ برابر جاری ہے۔

اس موقع پر اسلام کی طرف نظر جاتی ہے تو اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے دیگر مسائل کی طرح وہ اس مسئلہ کو بھی اس طرح حل کرتا ہے کہ اس سے بہتر حل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ اس ظالمانہ سسٹم کے خلاف عدل و انصاف پر مبنی ایک نیا سسٹم پیش کرتا ہے۔ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کی نشان دہی کی جارہی ہے۔

اسلام ہرطرح کے استحصال کا مخالف ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا یا ایک گروہ دوسرے گروہ کا کسی بھی طرح استحصال کرے۔ وہ ظلم وزیادتی کے ہر امکانی راستے پر روک لگاتا اور انسان کو عدل وانصاف کا پابند بناتا ہے۔

دنیا کا ہر نظام، تقسیم کار کی بنیاد پر چلتا ہے۔ یہ تقسیم صلاحیت کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ کہ طبقات اور گروہوں کی بنیاد پر۔ نہ کوئی طبقہ کسی کام سے محروم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی طبقے کے لئے خدمات، عہدے اور مناصب لازمی طور پر محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔ آزادیٔ فکر کے ساتھ عمل کی آزادی بھی ہونی چاہیے۔ یہی فطری اصول ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

اسلام کی ہدایت ہے کہ کوئی فرد یا گروہ معاشی اعتبار سے کمزور ہو تو اسے اوپر اٹھانے اور مضبوط بنانے کی کوشش کی جائے اور اسے بے بسی اور بے کسی کے حال میں نہ چھوڑا جائے۔ اس کی مشکلات میں کام آنا اور اس کی ترقی کی راہ کی ہر رکاوٹ دور کرنا افراد اور اداروں کی ذمہ داری ہے۔ ریاست کی ذمہ داری اس معاملہ میں سب سے زیادہ ہے۔

تعلیم کے میدان میں شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہونا چاہے۔ ہر ایک کو اس کے مواقع حاصل ہوں کہ وہ علم کے جس شعبے میں آگے بڑھنا چاہے بڑھے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام نے معاشرہ میں علم کی عام فضا پیدا کی، جس کے نتیجہ میں ہر طبقہ، ہر علاقے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے علم کی راہیں کھلی رہیں اور ہر میدان میں انہوں نے ترقی کی، قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ جیسے خالص اسلامی علوم کے علاوہ ادب، تاریخ، سماجی علوم، فلسفہ، سائنس، طب اور ریاضی کے میدان میں بھی عرب و عجم کے ہر طبقہ نے پیش قدمی کی اور اپنا حصہ ادا کیا بلکہ مختلف علوم کے فروغ اور ترقی میں عجمیوں کا حصہ اہل عرب سے زیادہ رہا۔

ہر طبقہ کے افراد نے اپنی صلاحیت کی بنیاد پر دینی امامت و قیادت بھی کی اور زمامِ حکومت بھی سنبھالی اور اونچے مناصب حاصل کئے کسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ سماج میں کمزوروں اور طاقتوروں کے درمیان مساوات پیدا کی۔ چھوٹے بڑے، پست و بالا اور اونچ نیچ کے تصور کو ختم کیا اور سب کو یکساں حقوق دیئے۔ سماج میں جب تک برابری کا احساس نہ ہو آدمی نفسیاتی طور پر اونچ نیچ کا شکار رہے گا۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ خدا کے نزدیک کامیابی وناکامی کا معیار طبقات اور گروہوں

پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ اس کے علاوہ پستی اور بلندی کے سارے معیارات جھوٹے ہیں۔ یہاں علم و عمل کے لحاظ سے جو بلند و برتر ہوگا خدا کے ہاں بھی وہی بلند و برتر ہوگا، جو یہاں اس دولت سے محروم ہوگا وہاں وہ مفلس سمجھا جائے گا اور خسرانِ عظیم سے دوچار ہوگا۔

لیکن افسوس کہ اسلام کے اس تصور کو اس ملک میں عام کرنے کی کوشش ایک طویل مدت سے نہیں ہوسکی اور خود اسلام کے ماننے والے یہاں کی تہذیب کے زیر اثر جھوٹے امتیازات کے شکار ہوگئے اور بلندی و پستی کے ان معیارات کو عملاً قبول کرلیا جو اس ملک میں رائج تھے۔ ورنہ اسلام اس ملک کے لئے حیات بخش پیغام ثابت ہوتا۔ اور طبقات میں بٹا ہوا یہ معاشرہ اور ظلم و زیادتی کی ماری ہوئی یہ انسانی آبادی اس کے پیغامِ مساوات پر لبیک کہتے ہوئے اس طرح آگے بڑھتی جیسے دھوپ کی شدت میں پیاسا ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی طرف بڑھتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان، اہل وطن کو ساری دنیا کے خالق و پروردگار کے عطا کردہ اس نظام عدل و انصاف کی طرف اپنے قول و عمل سے دعوت دیں اور یہاں کی طبقات پر مبنی تہذیب کے غلط اثرات سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے امت واحدہ بن جائیں اور اہل ملک کو بھی سماجی انصاف کے حصول کی حقیقی راہ دکھائیں۔

(ماہنامہ ''زندگی نو''، نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۶ء)

برصغیر کی اسلامی تاریخ[1]

ہمارے اس برصغیر کو اپنے رقبہ، آبادی اور بعض دوسرے پہلوؤں سے برعظیم کہنا شاید غلط نہ ہوگا۔ اس میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کا اسلام سے اتنا گہرا اور مضبوط رشتہ ہے اور ان کے ایک ایک خطہ پر اس کے اتنے وسیع اور دور رس اثرات ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس برصغیر نے اسلام کا جس بڑے پیمانے پر استقبال کیا ہے اور اس کے ماننے والوں نے جو وسیع اور متنوع خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا اتنا اہم اور نمایاں حصہ بن چکی ہیں کہ ان کو الگ کر دیا جائے تو اسلامی تاریخ بھی ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی۔ اس طرح برصغیر کی اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر صرف یہی نہیں کہ اس کی تاریخ کا حق ادا نہیں ہوسکتا بلکہ خود اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔

برصغیر کی اسلامی تاریخ اپنے گوناگوں پہلو رکھتی ہے اور مختلف زاویوں سے اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

صحیح رخ سے مطالعہ

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ اس کا صحیح رخ سے مطالعہ کیا جائے۔ غلط رخ سے مطالعہ ہوگا تو نتائج بھی غلط ہی اخذ کئے جائیں گے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مطالعہ کا غلط رخ آدمی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

برصغیر ''اسلامی علوم'' کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ اسلامی علوم میں معقولات اور منقولات دونوں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ اور

---

[1] اس وقت برصغیر کے تین ممالک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پیش نظر ہیں۔

ادب ہی پر نہیں منطق، فلسفہ، ریاضی اور طب وغیرہ پر جو کام ہوا اس نے ان علوم کو ایک عرصہ تک، جب کہ وہ اسلامی ممالک میں روبہ زوال تھے، زندہ رکھا اور انہیں آگے بڑھایا۔ اس سلسلہ میں یہاں ایسی علمی خدمات انجام پائیں کہ اسلامی دنیا انہیں نظر انداز نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں جو علمی وفکری کوششیں ہوئیں ان میں سے بعض کتاب وسنت کے مطابق تھیں تو بعض پر ہندی اور عجمی فلسفہ کا اثر تھا۔ جب ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا تو غلط سے غلط اور باطل سے باطل خیالات کو بھی، جن کی اسلام صراحت کے ساتھ تردید کرتا ہے 'اسلامی فلسفہ' قرار دے دیا جاتا ہے اور ان کے علم بردار 'اسلامی فلاسفہ' اور حکماء تصور کئے جانے لگتے ہیں۔ اس لئے اس پورے علمی کام کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس میں خالص اسلامی رنگ کس حد تک تھا اور کہاں یہ رنگ دھندلا پڑگیا یا ختم ہوگیا۔ اس کے بغیر اس کی اسلامی قدر و قیمت متعین نہیں ہوسکتی۔

جس طرح اسلام کے ماننے والوں سے فکری لغزشیں ہوسکتی ہیں اسی طرح ان سے سیرت وکردار اور عمل کی غلطیوں کا بھی امکان ہے۔ اسلام نے عبادات اور اخلاق سے لے کر معاشرت، تہذیب اور سیاست تک پوری زندگی کو ایک خاص رخ عطا کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے ماننے والے اسی رخ پر چلیں۔ ان کی روش اس کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ ان کے جس رویہ کی اسلام تائید کرے بلاشبہ وہ تو اسلامی ہوگا، لیکن جو رویہ اسلام سے ہم آہنگ نہ ہو اور جسے اسلامی تعلیمات سند جواز نہ دے رہی ہوں اسے کسی طرح اسلام سے جوڑا نہیں جاسکتا۔ لیکن کبھی کبھی اسلام اور مسلمانوں کے عمل کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کا عمل آگے آگے اور اسلام پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ یہ غلط انداز فکر ایک ایسے شخص کو عابد و زاہد بلکہ ولی قرار دے سکتا ہے جو عبادات ہی کو سرے سے چھوڑ کر احوال و مقامات طے کررہا ہو یا عبادت کے لئے جنگلوں اور غاروں میں جا بیٹھا ہو۔ حالانکہ نہ ترکِ عبادت اسلام ہے اور نہ گوشہ گیری اور رہبانیت۔ وہ دونوں کے خلاف ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ رقص و موسیقی کو 'اسلامی تہذیب' کی حیثیت دے دی جاتی ہے اور خالص غیر اسلامی رسوم و رواج کو بھی ''اسلامی معاشرت''

کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی فرد اسلام کا محض نام لے اور وہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلو سے کسی قدر ممتاز ہو تو اسلام کا زبردست نمائندہ بن جاتا ہے اور اس کے غلط فیصلے اور غلط اقدامات بآسانی اسلام کی طرف منسوب کردئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بڑی ناانصافی اور علمی بددیانتی ہے کہ جن اعمال کے مٹانے کے لئے اسلام آیا ہے اور جن سے برأت کا وہ بار بار اعلان کرتا ہے انہیں اسلامی اعمال کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور جو لوگ ان کا ارتکاب کریں وہ اسلام کے پیرو سمجھے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عمل اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق اور ان کے قائم کردہ حدود میں ہوگا وہی اسلامی کہلائے گا اور اسلامی تاریخ کا جزء ہوگا اور جو ان حدود سے خارج ہوگا، اسے دنیا چاہے کوئی عظیم کارنامہ ہی کیوں نہ قرار دے، اسے کسی طرح اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔

اعتراضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ

برصغیر کی اسلامی تاریخ کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اس پر بعض شدید اعتراضات کئے جاتے ہیں انہیں دور ہونا چاہیے۔ اس کی وضاحت دو ایک مثالوں سے ہوسکتی ہے۔

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کو یہاں کی بہت بڑی آبادی نے قبول کیا۔ بعض بعض خطے پورے کے پورے اس کے حلقہ بگوش ہوگئے اور جہاں یہ صورت پیدا نہیں ہوئی وہاں کی بھی قابل لحاظ آبادی نے اسے اپنالیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح اسلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں پھیلا بلکہ مسلمانوں، خاص طور پر ان کے حکم رانوں کے جور وظلم سے ڈر کر اسے اختیار کرلیا گیا۔ یہاں کی آبادی نے برضا ورغبت اسلام کو سینہ سے نہیں لگایا بلکہ جبر وتشدد کے ذریعہ اسے ان پر مسلط کیا گیا۔ مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اس قدر ظلم کیا کہ ان کے لئے اپنے مذہب پر باقی رہنا مشکل ہوگیا۔ اس کے باوجود جنہوں نے ہمت کی ان کے مذہب اور دھرم کو تحریص اور لالچ کے ذریعہ خرید لیا گیا۔ یہ اعتراض کئی وجوہ سے سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا کہ مسلمانوں نے جبر و تشدد کے ذریعہ اسلام کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا ہو۔

دوسری بات یہ کہ اس اعتراض کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اسلام کو صرف ان خطوں میں پھیلنا چاہیے جہاں مسلمان برسر اقتدار تھے اور ان علاقوں کے لوگوں کو اسے قبول نہیں کرنا چاہیے جہاں مسلمانوں کا اقتدار نہیں تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شمالی بھارت نے اسے قبول کیا جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اسی طرح کیرلا اور مشرقی ساحل کے علاقوں میں بھی وہ پھیلا۔ پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ جو علاقے مسلم مرکزی حکومت سے جتنی دور تھے، جیسے مغرب میں پنجاب اور مشرق میں بنگال اور آسام، وہاں اسے اتنا ہی زیادہ فروغ ملا۔

تیسری بات یہ کہ یہ کہنا بھی سراسر زیادتی ہے کہ یہاں کے باشندوں کے لئے اسلام میں کوئی کشش نہیں تھی۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اس وقت کے برِ صغیر کے حالات اور اسلام دونوں ہی سے ناواقف ہو۔ اسلام نے توحید، آخرت، مساوات، تقویٰ و طہارت اور پاکیزہ اخلاق و اطوار کا جو تصور پیش کیا اسے یہاں کی سسکتی، بلکتی اور طبقاتی کشمکش اور رسوم و رواج کی ماری ہوئی آبادی نے اپنے لئے آبِ حیات سمجھا۔ اسے اسلام کے سایۂ عاطفت میں وہ سکون اور امن و امان ملا جس کی اسے تلاش تھی اور جس کے بغیر زندگی اس کے لئے وبال بنی ہوئی تھی۔

چوتھی بات یہ کہ اس اعتراض میں یہاں کے عالموں، صوفیوں، تاجروں اور خدا کے ان بہت سے نیک بندوں کی ان کوششوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو انہوں نے اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں انجام دیں۔ ان کے پاس نہ تو سیاسی طاقت تھی اور نہ تحریص اور لالچ کا سامان تھا، البتہ ان کی زندگیاں اسلام کا نمونہ تھیں۔ ان میں وہ مقناطیسیت تھی کہ جب وہ اسلام کو لے کر برصغیر کے ایک ایک گوشہ میں پہنچے اور لوگوں نے ان کے اندر تقویٰ، اخلاق، ہمدردی اور محبت کو دیکھا تو اس کی طرف بے اختیار کھنچ پڑے۔

پانچویں اور آخری بات یہ کہ انسان کو اپنا مذہب، جان، مال اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر طرح کی قربانیاں دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ اگر

ہم کسی فرد کے بارے میں تھوڑی دیر کے لئے یہ تصور کر بھی لیں کہ اس نے خوف یا لالچ کی بنا پر اپنا دھرم چھوڑ دیا تو برصغیر کی اتنی بڑی آبادی کے بارے میں یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ اس نے کسی مجبوری میں اس طرح کا اقدام کیا ہوگا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ ایک پوری قوم کے مذہب کو زبردستی بدلا جائے اور وہ اس معاملہ میں کسی قسم کی مزاحمت اور کشمکش نہ کرے۔ پھر اس سے بھی زیادہ ناممکن بات یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنا دھرم بدلیں وہ اس نئے دین کے مخلص اور وفادار بن جائیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر سے ایسے مخلص اور وفادار مسلمان ابھرے اور انہوں نے اسلام کی خاطر اتنی زبردست قربانیاں دیں کہ اسلامی تاریخ ان پر فخر کرسکتی ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسلمان غیر ملکی ہیں۔ انہوں نے اسے اپنا وطن نہیں سمجھا۔ چنانچہ ابھی تک وطن سے ان کے تعلق کو چیلنج کیا جاتا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کو اس بنیاد پر غیر ملکی کہا جائے کہ وہ عرب یا ایران اور افغانستان سے آئے تھے تو ہندوستان کی آرین نسل کو بھی غیر ملکی ہی کہا جائے گا جو کہ وسط ایشیا سے آئے اور یہاں کی دراوڑین آبادی کو جنوب کی طرف ڈھکیل کر خود آباد ہوگئے۔ لیکن اگر غیر ملکی اس معنی میں کہا جائے کہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھا اور دوسرے کسی ملک سے ان کی ذہنی وابستگی رہی تو یہ بھی سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے برصغیر کو اس طرح اپنا وطن بنایا کہ جن علاقوں سے وہ آئے تھے ان کی یاد بھی شاید ان کے ذہنوں سے نکل گئی اور بالآخر یہیں کی خاک کا پیوند ہوگئے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان حملہ آور ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی دولت و ثروت کو لوٹنے کے لئے اس پر حملے کئے، یہاں کی آبادی کا استحصال کیا اور اسے تاراج اور برباد کیا۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کا مقصد لوٹ مار ہوتا تو انہیں یہاں کی دولت ان ممالک کو منتقل کرنی چاہیے تھی جہاں سے وہ آئے تھے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہاں جو کچھ حاصل کیا اسے اسی سرزمین کی فلاح و بہبود پر صرف کیا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طرح یہاں کی دولت سمیٹ کر نہیں لے گئے اور اس ملک کو برباد کر کے کسی دوسرے ملک کو ترقی نہیں دی۔

مسلمان حکم رانوں سے شکایت کی حقیقت

اسی ذیل میں مسلمانوں کے دور حکومت سے اور خاص طور پر مسلم حکم رانوں سے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے مخالفین کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کی۔ اس سلسلہ میں بعض بڑی بھیانک کہانیاں بیان کی جاتی ہیں اور بعض اوقات اسے اسلام سے بھی جوڑ دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہاں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سی خامیاں تھیں۔ یہاں کا سیاسی نظام کبھی خالص اسلامی نظام نہیں تھا۔ اس لئے اس کی کسی بھی غلطی کو اسلام کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ برصغیر کے مسلم حکم راں، اسلام کے مکمل نمائندے نہیں تھے اور انہوں نے کبھی اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ ان میں اچھے برے ہر طرح کے حکم راں تھے۔ یہاں کے غیر مسلم حکم رانوں سے بھی ان کی جنگیں ہوئیں اور وہ آپس میں بھی برسرپیکار رہے۔ انہوں نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت ایسے اقدامات بھی کئے جنہیں ہم کسی طرح اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

تیسری بات یہ کہ حکم رانوں کے ظلم و زیادتی کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر ان کے سیاسی حریفوں سے ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ مسلمان تھے یا غیر مسلم۔ ورنہ انہوں نے دیگر مذاہب کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا اور انہیں جس طرح دولت اور جاگیروں سے نوازا، اس کی مثالیں مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہیں۔ اگر مسلم حکم رانوں کی سیاسی غلطیوں کو اسلام کی طرف زبردستی منسوب کیا جاسکتا ہے تو ہمیں فراخ دلی سے یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے اور یہ اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف ہوگا کہ ان میں جو خوبیاں تھیں وہ اسلام ہی کی بدولت تھیں۔ اسلام ان تمام خوبیوں کی ترغیب اور تعلیم دیتا ہے جو انسان کے لئے سربلندی اور افتخار کا ذریعہ ہیں اور ان تمام برائیوں سے روکتا ہے جو اس کے لئے باعثِ ننگ ہوسکتی ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم حکم رانوں میں جو خوبیاں تھیں وہ

اسلام ہی نے پیدا کیں اور ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ تھیں۔

چوتھی بات یہ کہ جن حکم رانوں کی 'زیادتیوں' کا اس قدر شکوہ یا چرچا کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر مسلمانوں ہی کو نہیں، اسلام کو بھی لعنت ملامت کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے اس ملک کو جو عروج اور ترقی نصیب ہوئی اس سے اس ملک کی تاریخ خالی نظر آتی ہے۔ انہوں نے یہاں کی زراعت، صنعت، تجارت اور معیشت کو غیر معمولی ترقی دی۔ زبردست رفاہی خدمات انجام دیں، مدارس، شفا خانے، سڑکیں، قلعے اور مسافر خانے تعمیر کیے۔ اس کے ساتھ اس پورے علاقہ کو پہلی مرتبہ سیاسی طور پر متحد و منظّم کرنے کی کوشش کی اور اسے صاف ستھری تہذیب اور اعلیٰ تمدن عطا کیا۔ اس طرح مختلف پہلوؤں سے اس ملک کو آگے بڑھایا اور عروج پر پہونچایا۔ افسوس کہ مسلم حکم رانوں کی زیادتیوں کا ذکر کرنے والے ان احسانات کو بالکل بھول جاتے ہیں، بلکہ ان کا تذکرہ بھی انہیں بار گزرتا ہے۔

امت کے داخلی مسائل اور ان کے حل کی کوششیں

پوری دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی مسلم آبادی برصغیر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بے شمار تعلیمی، معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل رہے ہیں۔ ان مسائل کو اس نے ہمیشہ اپنے داخلی مسائل سمجھا اور انہیں حل کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کرتی رہی ہے۔ یہاں بعض کوششوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اسلام نے زندگی کا ایک خاص تصور دیا ہے۔ جو اپنے ماننے والوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان جب کبھی کسی غیر اسلامی فکر و فلسفہ سے متاثر ہوئے یا ان کی تہذیب، معاشرت اور طور طریقوں میں غیر اسلامی عناصر داخل ہوئے تو اس کی اصلاح کی بھی مسلسل کوششیں ہوتی رہیں۔

۲۔ یہاں ہر دور میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری نشو و نما کے لئے مکاتب و مدارس اور علمی و تحقیقی شعبے وجود میں آئے، سماجی فلاح و بہبود کے بہت سے کام ہوئے، یتیم خانے اسپتال، مسافر خانے اور اسی نوعیت کے رفاہی ادارے قائم

ہوئے، صنعت وحرفت کے مراکز تشکیل پائے۔ یہ سب کام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوتے رہے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نمایاں حصہ بن چکے ہیں۔

۳۔ برصغیر میں دعوت وتبلیغ کا کام بھی ہوتا رہا اور اس بات کی بھی کوشش ہوتی رہی کہ اللہ کا دین پھیلے اور غالب آئے اور پوری زندگی اس کے تابع ہوجائے۔ اس کے لئے انفرادی طور پر بھی جدوجہد کی گئی، انجمنیں، ادارے اور تنظیمیں بھی وجود میں آئیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اندر ہونے والے ان تمام کاموں کا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ ٹھیک اسلامی خطوط پر ہوتے رہے ہیں یا اُن میں کہیں فکری وعملی انحراف بھی پایا گیا۔ پھر یہ کہ یہ سارے کام کن حالات میں انجام دئے گئے ان حالات میں وہ کس حد تک موزوں تھے اور ان کے کیا نتائج نکلے؟ اگر مطلوبہ نتائج نہیں نکل سکے تو اس کے کیا اسباب تھے؟ یہ جائزہ اس انداز سے ہونا چاہیے کہ وہ مستقبل کے لئے ایک نیا لائحۂ عمل بن سکے۔

اس میں شک نہیں کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر بڑا اچھا کام ہوا ہے، جو اپنی تلاش اور محنت کے لحاظ سے قابل قدر ہے، لیکن اس پر بالعموم غیر اسلامی نقطۂ نظر غالب ہے۔ جن لوگوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کام کیا ہے ان کے اندر ماضی کا تنقیدی جائزہ لینے کی ہمت اور صلاحیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ ابھی اس پہلو سے باقی ہے کہ اسلام جس فکر وعمل کو حق کہے اسے حق کہا جائے اور جس کو باطل کہے اسے باطل کہا جائے۔ غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، اعتراضات کا جواب دیا جائے، اس کے ساتھ کسی حقیقی کوتاہی کو تسلیم کرنے میں تامل بھی نہ کیا جائے۔

(سہ ماہی ''تحقیقات اسلامی''، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۴ء)

مسلمانوں کا ماضی قریب، حال اور مستقبل

(سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی کے سوال نامہ کے جوابات)

(سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی نے ماضی، حال، مستقبل (بیسویں صدی کے تجربات کی روشنی میں) کے عنوان پر مختلف مسلم حلقوں کے اصحاب علم و دانش سے سولہ سوالات کئے اور موصولہ جوابات ایک خصوصی شمارہ کی شکل میں ۲۰/اپریل ۲۰۰۰ء کو شائع کردیے۔ ''دعوت'' کے سوالات اور راقم کے جوابات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔)

(جلال الدین)

سوال نمبرا: آپ کے خیال میں اسلام، ملتِ اسلامیہ اور مسلمانانِ برصغیر کے تعلق سے بیسویں صدی کیسی رہی؟

جواب: بیسویں صدی بعض پہلوؤں سے امت مسلمہ کے لئے مسرت بخش اور حوصلہ افزا رہی تو بعض پہلوؤں سے تکلیف دہ بھی رہی ہے اور اسے متعدد صدمات برداشت کرنے پڑے ہیں۔

سیاسی رخ سے دیکھئے تو اس صدی میں مسلم ممالک پر سے مغرب کی سیاسی بالادستی اور حکمرانی ختم ہوئی، ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوئے، سوویت یونین کے جبر واستبداد سے مسلم ریاستوں نے نجات پائی، افغانستان میں سوویت فوج کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ایران میں دینی انقلاب آیا۔ بحیثیت مجموعی ان واقعات میں امت کے لئے مفید اور بہتر پہلو ہیں۔ دوسری طرف فلسطین کا مسئلہ، بوسنیا اور چیچنیا کے حالات، کویت پر عراق کا

قبضہ پھر اس کی واپسی، اس پھانے اس پر مغرب کی یلغار، افغانستان کی خانہ جنگی جیسے مسائل امت کے لئے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کب تک ان کا سلسلہ جاری رہے گا۔

دینی اور عملی رخ سے دیکھیے تو بھی یہی صورت حال نظر آئے گی۔ اس صدی میں ہمیں بہت سی نمایاں اور معتبر علمی اور فکری شخصیتیں ملیں، جنہیں دینی علم میں گہرائی، بصیرت اور ژرف نگاہی کے لحاظ سے اسلاف کے بہترین نمائندے اور جانشین کہا جاسکتا ہے۔ اس معاملے میں برصغیر زیادہ خوش قسمت ہے، جس میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، مولانا شبلی، مولانا حمید الدین فراہی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا سید ابوالحسن ندوی جیسی ممتاز اور یگانۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ یہ فہرست ادھوری اور نامکمل ہے یہاں معقولات و منقولات کی جامع صرف بعض شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ علم دین کے کسی ایک شعبے اور ایک فن کے ماہرین کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ ان سب نے اسلام کی نمایاں خدمات انجام دیں اور اسلامی فکر کو عام کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کے نتیجے میں دینی علوم کی طرف بہتر توجہ ہوئی، اور ان میں ریسرچ اور تحقیق کا ذوق بڑھا، مغرب میں بھی اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔

.اس صدی میں امت کے اندر بعض جان دار اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں بھی اٹھیں۔ احیائے اسلام کا جذبہ ابھرا اور اس کے لئے وسیع پیمانے پر جدوجہد شروع ہوئی۔ مغرب کے فلسفے اور فکر، جسے غالب فکر و فلسفے کی حیثیت حاصل ہے، کے مقابلے میں اسلام کو ایک متبادل فکر کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ کم و بیش ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا جو مغرب نے اٹھائے، مغرب کی فکری برتری کے احساس اور اس سے مرعوبیت کو کم کیا گیا اور اسلام کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری مسلم دنیا میں اسلام کی طرف پلٹنے اور اس کو زندہ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اسلام ایک ایسی طاقت بن کر سامنے آرہا ہے کہ اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مسلم ممالک میں جس طرح ان کوششوں کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی گئی اور ظلم کے پہاڑ توڑے گئے،

اس سے امت کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک تکلیف دہ پہلو ہے کہ الجزائر اور ترکی وغیرہ میں احیائے اسلام کی آئینی اور جمہوری کوششوں کو غیر آئینی، غیر اخلاقی اور غیر جمہوری طریقوں سے دبانے کی کوشش ہورہی ہے۔

سوال نمبر ۲: انگریزی حکومت کے دور میں اور پھر اس حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک میں وہ کون سا کام تھا جو مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا مگر انہوں نے نہیں کیا۔ اور وہ کام جو نہیں کرنا چاہئے تھا مگر انہوں نے کیا؟

جواب: انگریزوں کے ہاتھوں مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہوئے اور ان کے بدترین ظلم وتشدد کا نشانہ بنے، اس سے سنبھلنے میں انہیں وقت لگا۔ جب انگریزوں کا اقتدار جم گیا تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ اقتدار ہی سے محروم نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کا دین اور ان کی تہذیب اور معاشرت بھی خطرے میں ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے انہوں نے خود سے دینی تعلیم کا نظم کیا، تاکہ مسلمان دین سے باخبر بھی رہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوسکیں۔ یہ مسلمانوں کے عقیدے، تہذیب اور معاشرت کو بچانے کی ایک مثبت کوشش تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ امت کا دین سے رشتہ برقرار رہا اور حکمراں طبقہ اس پر اپنے نظریات اور اپنی تہذیب پوری طرح مسلط نہ کرسکا۔

دوسری طرف مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی، تاکہ وہ وقت کے رفتار سے پیچھے نہ رہ جائیں، زمانے کے تقاضوں اور حالات کو سمجھیں اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں۔ معاش کے ذرائع بھی بڑی حد تک اس تعلیم سے وابستہ تھے، اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس طرف توجہ کی جائے تاکہ وہ معاشی لحاظ سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کوششیں قابل قدر تھیں۔ جن نازک اور مشکل حالات میں یہ کوششیں کی گئیں، اس سے ان کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے موقف میں شاید مسلم قیادت نہیں تھی، لیکن اس اعتراف کے باوجود اس میں جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دینی تعلیم اس طرح نہ ہوسکی کہ اسلام کی برتری کا نقش دل و دماغ پر بیٹھ جائے اور اسے دوسرے افکار ونظریات

کے مقابلہ میں اعتماد کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت ابھرے۔ دینی تعلیم کے ادارے خاص خاص فقہی مسالک کے ترجمان بنے رہے۔ ذہنوں میں وسعت اور کشادگی نے جگہ نہیں پائی۔ اسلام نے فروع سے زیادہ اصول پر زور دیا ہے اور یہاں اصول سے زیادہ فروع نے اہمیت اختیار کرلی۔ نئے حالات اور مسائل سے بے خبری نے انہیں دینی لحاظ سے صدیوں پیچھے رکھا۔ یہ ایک عمومی صورت حال ہے، ورنہ ان ہی مدارس سے وہ شخصیتیں بھی ملیں جو حالات سے باخبر تھیں اور جن کے ذریعہ امت کو بروقت ممکنہ رہنمائی حاصل ہوتی رہی۔

دوسری طرف جو افراد جدید تعلیم سے آراستہ تھے وہ حالات سے تو باخبر تھے، ان کے لئے معاش کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ اقتدارِ وقت کے زیر سایہ اونچے عہدوں پر بھی فائز تھے، لیکن دین سے ان کا رشتہ کم زور رہا۔ دوسرے یہ کہ جدید تعلیم نے ان کی ذہنی سطح کو بھی بہت بلند نہیں کیا۔ وہ نوکری چاکری اور ملازمت کے قابل تو ہوئے لیکن ان میں ایسے ممتاز اور نمایاں افراد کم ہی نکلے جو امت کے لئے سرمایہ ہوں، جن کی امامت و قیادت کو کسی بھی میدان میں دنیا نے تسلیم کیا ہو اور جن پر ناز کیا جا سکے۔

جدید اور قدیم تعلیم کے اس علیحدہ نظام نے مستقل دو طبقے پیدا کردئے اور دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل کردی۔ ہم نے تعلیم کے ذریعے امت کی فلاح کی تدبیر سوچی لیکن کوئی ایسا منصوبہ ہمارے سامنے نہیں تھا جس کے تحت ایک ساتھ جدید و قدیم تعلیم دی جا سکے یا جدید و قدیم تعلیم سے یکساں فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اب ملک کی آزادی کے مسئلے کو لیجئے۔ مسلمان آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان کے اندر دینی اور سیاسی اسباب کی بنا پر انگریزوں سے نفرت کا جذبہ دوسروں سے زیادہ تھا۔ وہ آزادی کی تحریک میں پورے جوش وخروش سے برادرانِ وطن کے ساتھ رہے۔ آج ان کی جدوجہدِ آزادی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس جدوجہد میں ان کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ رہا ہے اور اس کے لئے انہوں نے دوسروں سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس جدوجہد میں یہ بات شاید بہت زیادہ واضح نہیں تھی کہ آزادی کے بعد ملک کا سیاسی نقشہ کیا ہوگا

اور اس میں اسلام اور مسلمانوں کا مفاد کس طرح محفوظ رہے گا؟ اسی وجہ سے آزادی کے بعد جب یہ مسائل اچانک سامنے آئے تو مسلمان ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے جس کے حل کی تدبیر پہلے سے سوچی نہیں گئی تھی۔

سوال نمبر۳: آپ کے نزدیک تحریکِ خلافت کے اثرات ملکی صورت حال پر بالعموم اور مسلمانوں کے حالات پر بالخصوص کیا رہے؟

جواب: تحریکِ خلافت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کا سیاسی تصور ابھرا، اس کے لئے حکومت اور اقتدار کی اہمیت واضح ہوئی اور یہ بات سامنے آئی کہ مسلمانوں کا ایک سیاسی مرکز ہونا چاہیے۔ ملک کی سیاست پر بھی اس کا اثر پڑا۔ انگریزوں کے خلاف جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی اور اس سے آزادی کی تحریک کو تقویت ملی، لیکن یہ تحریک حالات کے زیر اثر دب گئی۔ اسے صحیح ڈھنگ سے چلایا جاتا اور اس سلسلے میں جو علمی سوالات اور عملی مسائل سامنے آرہے تھے، ان کا جواب دیا جاتا تو شاید مسلمانوں کی سیاست کو ایک متعین رخ دینے میں مدد ملتی۔

سوال نمبر۴: آپ کی رائے میں تحریکِ پاکستان یا تقسیم ہند کی تحریک کن حالات کا نتیجہ تھی۔ اس کے لئے اصلاً کون ذمہ دار ہے اور کیا تقسیم کو روکا جاسکتا تھا؟

جواب: اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ اس کے ذمے دار برادرانِ وطن اور مسلمان دونوں ہی ہیں۔ دونوں خوف کی نفسیات کا شکار تھے اور ایک ساتھ رہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے تقسیم عمل میں آئی۔ اس پر بحث بہت زیادہ سود مند نہیں ہے۔ اب ہندوستان اور پاکستان اور اس کے بعد بنگلا دیش ایک حقیقت بن چکے ہیں۔ اسے مان کر ہمیں مسائل پر غور کرنا اور انہیں حل کرنا چاہیے۔

سوال نمبر۵: آزادی کے بعد ہندستانی مسلمان مختلف النوع مسائل سے دوچار رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آپ کے خیال میں ان مسائل و مشکلات کے لئے کون کتنا ذمہ دار ہے؟

جواب: اس میں شک نہیں کہ اس میں برسر اقتدار طبقے اور ہمارے مخالفین اور معاندین کی تدبیروں اور کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے، لیکن ہمارا حصہ بھی کم نہیں ہے۔

مخالفین نے ہمیں مختلف مسائل میں الجھائے رکھا اور ہم الجھتے رہے۔ اپنے نصب العین اور مقصد وجود کا شعور کم ہی رہا۔ ہم نے اپنی کم زوریوں کو دور کرنے، اپنے حالات کو ٹھیک کرنے اور اپنی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہمارے اندر مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ، جو قوموں کو زندگی اور توانائی عطا کرتا ہے، نہیں پیدا ہوا۔

سوال نمبر۶: آزادی کے بعد وہ کون سے کام ہیں جو مسلمانوں کو کرنے چاہیے تھے اور کن کاموں سے بچنا چاہیے تھا؟

جواب: جو کام مسلمانوں کو پہلے کرنے چاہیے تھے اور اب بھی کرنے چاہیے وہ یہ ہیں۔ اللہ کے دین سے اپنا رشتہ مضبوط کریں۔ اسی میں ان کی تمام خرابیوں اور کم زوریوں کا علاج ہے۔ دینی اور دنیوی تعلیم میں پیش قدمی کریں۔ تعلیم سے ہی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ ایک بااخلاق و باکردار امت کی حیثیت سے ملک میں اپنا مقام بنائیں، اپنی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کریں، تاکہ ان کی دولت اور وسائل وذرائع، نام ونمود، ناجائز اور غیر پسندیدہ کاموں میں ضائع نہ ہوں۔ اور ملت کی حقیقی ضروریات اور اعلیٰ مقاصد میں ان کا استعمال ہو سکے۔ ملت کے کم زور طبقات کو اوپر اٹھانے کی منظّم اور مربوط کوشش کریں۔

سوال نمبر۷: ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی صورت حال پر روشنی ڈالیں۔

جواب: عیاں را چہ بیان؟ مسلمان سیاسی، معاشی اور تعلیمی ہر پہلو سے ملک کے دوسرے طبقات سے پیچھے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں جب کہ چاروں طرف، تعصّبات اپنا حلقہ مضبوط کئے ہوں، مقابلہ آسان نہیں ہے۔ غیر معمولی محنت، جاں فشانی اور قابلیت ہی سے وہ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مذہب سے ان کا تعلق کم زور ہے اور معاشرت پر غیر اسلامی اثرات موجود ہیں۔

سوال نمبر۸: آپ کے نزدیک وہ کون سے اہم مسائل ہیں جو آج ہندستانی مسلمانوں کو بحیثیت ملتِ اسلامیہ درپیش ہیں؟

جواب : بعض اہم مسائل یہ ہیں۔ مسلم پرسنل لاء کا تحفظ، دینی تشخص کو برقرار رکھنا، مذہبی آزادی، اخلاقی برتری، تعلیمی ترقی اور معاشی استحکام۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ امت کے اندر اس احساس کو بیدار کیا جائے اور اس کے لئے اسے تیار کیا جائے کہ وہ خیر امت ہے۔ اس کی زندگی اس کے عین مطابق ہونی چاہیے۔ اس سے اسے ایک نئی زندگی اور توانائی ملے گی اور اپنے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بھی اس کے اندر خود بہ خود پیدا ہوگی۔

سوال نمبر۹: آج کل اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں نیز سرکاری حلقوں اور سیاسی مبصرین کی جانب سے ''اسلامی دہشت گردی'' کی جو اصطلاح بے دریغ استعمال کی جارہی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مغرب اپنے مذموم مقاصد کے لئے اس اصطلاح کا استعمال کررہا ہے۔ اس کی تقلید میں مشرق نے بھی، جس میں ہمارا ملک بھی داخل ہے، بلاتکلف اسے بولنا اور لکھنا شروع کردیا ہے۔ اسلامی دہشت گردی اسی طرح کی اصطلاح ہے جیسے کہا جائے اسلامی قزاقی، اسلامی آوارگی، اسلامی عیاشی، یا اسلامی فریب کاری۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی وہ کون سی تعلیمات ہیں، جن سے یہ اصطلاح نکالی گئی ہے۔ اسلام قتلِ ناحق، فساد فی الارض اور ظلم و عدوان سے سختی سے منع کرتا ہے۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کرتا کہ اس کے کسی بھی ماننے والے کا ہاتھ بے قصور افراد پر اٹھے گا اور وہ ناحق کسی کا خون بہائے گا، پھر اس کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ دہشت گردی کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے تیار کرے گا۔ اگر کسی کے خیال میں کچھ افراد اور تنظیموں نے دہشت گردی کی راہ اختیار کررکھی ہے تو اسے ان کا ذاتی عمل قرار دینا چاہیے، اسے اسلام سے منسوب کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ افسوس کہ اس اصطلاح کے پردے میں پوری امت مسلمہ ہند کو ملک کے سامنے مشکوک بنایا جارہا ہے۔

سوال نمبر۱۰: ہندستان کے بعض حلقوں کے اندر پائی جانے والی مسلم مخالف ذہنیت کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

جواب: یہ ایک واقعہ ہے اور اس کے ازالہ کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس کے لئے

ہندستان جیسے جمہوری ملک میں گفت وشنید، تبادلۂ خیال اور میڈیا کا مؤثر استعمال ہی بہتر تدبیر ہے۔ اس بات کے ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم نے اپنے مخالفین کے پاس پہنچنے اور ان تک اپنی بات پہنچانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اگر غلط فہمی ہماری کسی کوتاہی یا کسی رویہ اور طرز عمل کی بنا پر ہو تو اسے بدلنے میں بھی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بیشتر حالات میں دلائل سے زیادہ اخلاق و کردار سے مخالف کا دل جیتا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر۱۱: آپ کے خیال میں بیسویں صدی کے تجربات کی روشنی میں نیز ملک و ملت کی مجموعی صورت حال کے پیش نظر نئی صدی میں مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل (ایجنڈا) کیا ہونا چاہیے۔ اپنی دینی شناخت کے تحفظ نیز معاشرتی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے سلسلے میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: مسلمان کسی بھی ملک میں ہو، اس کا ایجنڈا اللہ اور اس کے رسول نے متعین کردیا ہے۔ موجودہ حالات میں اسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ دین کا فہم عام کرنا، اس کے کامل اتباع کا جذبہ ابھارنا، اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، برادرانِ وطن سے تعلقات استوار کرنا اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا، معاشی اور تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے حکومت جو وسائل اور مواقع فراہم کرتی ہے ان سے شرعی حدود میں فائدہ اٹھانا، اس کے ساتھ ان وسائل کو بروئے کار لانا جو خود اس کے بس میں ہیں۔ اتنی بڑی امت اپنے وسائل کو صحیح ڈھنگ سے جمع کرے اور کام میں لائے تو اس کی پس ماندگی باقی نہیں رہ سکتی۔

سوال نمبر۱۲: ملک کی موجودہ مسلم قیادت (سیاسی، دینی، فکری) کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟

جواب: مسلم قیادت چاہے وہ سیاسی ہو یا دینی اور فکری، بکھری ہوئی ہے۔ کسی کو ایک حلقہ کا اعتماد حاصل ہے تو دوسرے کا نہیں ہے۔ اس وقت کوئی فرد یا جماعت ایسی نہیں ہے جس کے گرد امت مجتمع ہوسکے۔ بعض مشترک مسائل پر امت کے قائدین یا نمایاں افراد جمع ہوتے ہیں اور زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ منتشر ہوجاتے ہیں۔ امت کا

کوئی بھی مسئلہ ہو، ہر گروپ اسے خود لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی کسی دوسرے کی پیش قدمی کو گوارا نہیں کرتا۔ کسی بھی فرد یا گروہ کی خدمات کے اعتراف کا کسی میں حوصلہ نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی امت میں اجتماعی جدوجہد کا مزاج نہیں بن پایا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف تو حالات کی نزاکت اور مسائل کی شدت کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ دوسری طرف آپس میں خلوص، محبت، تعاون، قربانی اور وسیع الظرفی جیسی اجتماعی خوبیوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ ابھی یہ دونوں باتیں بظاہر ہم میں پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے دائرہ میں کوشش کرنی ہوگی۔

سوال نمبر ۱۳: مسلم جماعتوں، اداروں اور رہنماؤں کے باہمی اتحاد کے لئے آپ کے ذہن میں کون سی ٹھوس تجویز ہے؟

جواب: فروعی اور جزوی اختلافات کو نظر انداز کر کے اسلام اور ملت کے عمومی مفاد کو مقدم رکھنا اور صحیح معنی میں اتحاد کے جذبہ سے آگے بڑھنا۔

سوال نمبر ۱۴: پارلیمانی سیاست کے اب تک کے تجربات کی روشنی میں مسلمانوں کو حسبِ سابق دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے یا اپنی سیاسی جماعت قائم کرنی چاہیے؟

جواب: کسی بھی سیاسی پارٹی میں مسلمانوں کی کوئی مؤثر آواز نہیں ہے۔ ہر پارٹی انہیں اپنا آلۂ کار بناتی رہی ہے۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان متحد ہوں اور اصول واقدار اور ملت کے مفاد کی بنیاد پر پارٹیوں سے معاملہ کریں۔ الگ سے کسی سیاسی پارٹی کے قیام کے لیے حالات ابھی سازگار نہیں ہیں۔

سوال نمبر ۱۵: اپنے مسائل کے علاوہ مسلمانوں کو ملکی مسائل کے حل، بالخصوص یہاں کی غریب، پسماندہ اور کچلی ہوئی آبادیوں کو اونچا اُٹھانے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا تعلق سب سے ہے۔ بعض مخصوص مسائل غریب اور پس ماندہ طبقات کے ہیں، ان کے حل کے لئے عملاً جو مناسب کوششیں ہو رہی ہیں ان میں تعاون ہونا چاہیے۔ مسلمان اپنے بل بوتے پر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۶: آپ کے نزدیک مسلمانانِ ہند دین اسلام کے امین ہونے کی حیثیت سے اس ملک اور یہاں کے تمام انسانوں کی فلاح ونجات کے لئے کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ نیز ہندوستان اور مسلم ملکوں کے درمیان بہتر، قریبی اور خوشگوار تعلقات کے قیام میں کیا رول ادا کرسکتے ہیں؟

جواب : امت مسلمہ کے پاس اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا دین ہے۔ اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس کا علم لے کر اٹھیں، یہ ان کی دینی ذمہ داری بھی ہے اور پورے ملک کے سامنے جرأت وہمت کے ساتھ اسے اس حیثیت سے پیش کریں کہ اسی سے صحیح معنی میں انسان اپنے خدا کو پہچان سکتا اور اس کی بندگی کی راہ اختیار کرسکتا ہے۔ اسی میں اس کی اخروی نجات ہے، اسی میں معاشرہ کی فلاح وبہبود ہے، اسی سے ملک میں اخلاقی قدروں کے فروغ کی سبیل نکل سکتی ہے، ظلم وزیادتی کا خاتمہ اور عدل وانصاف کا قیام ممکن ہے۔ اس دین نے وحدتِ الٰہ اور وحدتِ بنی آدم کا جو وسیع تصور دیا ہے اس کے ذریعہ یہاں اخوت، بھائی چارہ اور مساوات کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے یہ ملک کے مختلف طبقات کو جوڑنے اور شیر وشکر بنانے میں ایک کارفرما اور مؤثر قوت بن سکتا ہے اور اسے متحد اور مضبوط بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ خود امت کے اندر اسلام کی تعلیم کے اثرات نمایاں ہوں۔ وہ عبادات، اخلاق، معاشرت، معاملات اور تعلقات میں اسلامی ہدایات کی پابند ہوجائے، اس کی سیرت وکردار ملک کے لئے نمونہ بن جائے۔ موجودہ حالات میں یہ دونوں ہی باتیں بظاہر مشکل اور ناممکن العمل محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہر بڑی تبدیلی شروع میں دشوار ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن منصوبہ بند طریقہ سے اور مناسب حکمت عملی کے ساتھ اس کا آغاز ہوتو دشواریاں دور ہوں گی اور راہیں کھلیں گی۔

امت مسلمہ ہند، ہندوستان اور مسلم ممالک کے درمیان بہتر اور خوش گوار تعلقات کے لئے سفیر کی خدمات انجام دے سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو

مسلمانوں پر اعتماد کیا جائے اور دوسری طرف انہیں ازروئے دستور ہی نہیں عملاً بھی وہ تمام حقوق حاصل ہوں جو دستور نے دیے ہیں۔ ان کی شکایات کا ازالہ ہو، ان کی دینی، تعلیمی اور معاشی حیثیت مستحکم ہو اور وہ برادران وطن سے پیچھے نہ رہیں۔ انہیں دنیا کسی مظلوم گروہ کی حیثیت سے نہ دیکھے بلکہ ہندوستان کے برابر کے شہری کی حیثیت سے وہ ان کے پاس پہنچیں۔

(سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی۔ ماضی، حال مستقبل خصوصی پیش کش، ۲۸/اپریل ۲۰۰۰ء)

امت مسلمہ ہند کے لئے صحیح لائحہ عمل

اس وقت پوری امت مسلمہ تاریخ کے بڑے ہی نازک دور سے گزر رہی ہے۔ امت مسلمہ ہند، اسی اُمت کا ایک حصہ ہے۔ وہ بھی انتہائی مشکل حالات اور گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ اس کے حالات اتنے سخت اور اس کے مسائل اس قدر پیچیدہ ہیں کہ سوچنے سمجھنے والے بسا اوقات حیران اور ششدر رہ جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں جو اس امت کے عقیدہ وفکر، اس کے مزاج اور اس کی دینی روایات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔

ہندوستان جیسے ملک میں اس امت کا سب سے بڑامسئلہ یہ ہے کہ وہ یہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی کیسے گزارے؟ اپنے وجود اور تشخص کو کس طرح برقرار رکھے؟ اپنے بنیادی حقوق کی، جواز روئے دستور بھی تسلیم شدہ ہیں کیوں کر حفاظت کرے؟ اس کی معاشرت اور معیشت غیر اسلامی اثرات سے کیسے محفوظ ہو؟ یہاں برادران وطن کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہو؟ ان کے ساتھ کن حدود میں تعاون ہو اور عدم تعاون ہو تو اس کی کیا بنیادیں ہوں، اس کی راہ میں جو تعصّبات اور نفرتیں حائل ہیں، انہیں کس طرح دور کرے؟ ملک کی فضا کو اپنے حق میں کس طرح خوشگوار بنائے؟ یہاں کے سیکولر نظام سے اس کے ربط و تعلق کی کیا نوعیت ہو؟ اور موجودہ حالات میں وہ کون سی سیاسی حکمت عملی اختیار کرے؟

ان مسائل کی سنگینی اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس ملک میں تقریباً بارہ کروڑ کی تعداد میں (سرکاری اعداد وشمار کے اعتبار سے) ہونے کے باوجود یہ امت ایک اقلیت ہے۔ دیگر برادرانِ وطن کو، جو اکثریت میں ہیں، ہر میدان میں اس پر سبقت حاصل

ہے۔ وہ تعلیم میں، جو ترقی کا زینہ اورلازمی ذریعہ ہے، ان سے پیچھے ہے۔اس کے وسائلِ معیشت محدود ہیں اور وہ معاشی لحاظ سے کمزور ہے، ابلاغ وترسیل کے ذرائع پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے اس لئے وہ اپنی بات مؤثر انداز میں پیش نہیں کرسکتی۔ سیاست میں وہ کوئی قائدانہ کردار نہیں ادا کر پارہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان پیچیدہ حالات سے اس امت کے عہدہ برآ ہونے کی کوئی سبیل ہے؟ کیا وہ زوال سے نکل سکتی ہے جو اس پر ہر طرف چھایا ہوا ہے؟ کیا اس پر عروج و ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں؟ کیا وہ دینی واخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھ سکتی ہے؟ کیا اس کے لئے اس ملک میں قائدانہ کردار ادا کرنا ممکن ہے؟ اس کا جواب ایک جملے میں یہ ہے کہ ہاں یہ سب کچھ ممکن ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس خدائے ذوالجلال کے احکام وقوانین پر کاربند ہوجائے جو ہر پستی کو بلندی میں، ہرزوال کو عروج وترقی میں، اور ہر کمزوری کو قوت و طاقت میں تبدل کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور جس کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ **اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ.** (الحدید۔ ۱۷)

”خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد (بھی) زندہ کردیتا ہے۔ہم نے اپنی آیات کھول کر بیان کردی ہیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔“

جو خدائے بزرگ و برتر اپنے قوانین کے تحت مردہ زمین کو زندہ اور رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کردیتا ہے اسی کے متعین کردہ ضابطے قوموں کو عروج و زوال سے ہم کنار کرتے ہیں۔ عروج کے ضابطوں کو اختیار کرکے قومیں اپنی کمزوریوں پر قابو پالیتی ہیں، ان کے مسائل اس طرح حل ہونے لگتے ہیں جیسے وہ پہلے سے اپنے حل کے منتظر ہوں، ان کی راہ کی وہ ساری رکاوٹیں ایک ایک کرکے دور ہونے لگتی ہیں، جو ناقابل عبور سمجھی جاتی ہیں اور وہ تیزی سے ترقی کے زینے طے کرنے لگتی ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ وہ اصول کیا ہیں جو اس امت کو حیاتِ نو عطا کرسکتے ہیں۔

قوموں کے عروج وترقی میں ان کے نظریۂ حیات اور عقیدہ کا بڑا گہرا دخل ہوتا ہے۔ جس قوم کو اپنے عقیدے پر یقین کامل ہو، اس کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کا وہ

فیصلہ کرلے اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوجائے تو اس کی پیش قدمی کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ عقیدہ جتنا قوی اور مستحکم ہوگا اس کی رفتار ترقی اتنی ہی تیز ہوگی۔ اگر کسی قوم کا اپنے عقیدے پر ایمان ویقین ختم ہوجائے تو زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ اصول عقیدہ حق کے لئے بھی ہے اور عقیدہ باطل کے لئے بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو قوم عقیدۂ حق کو لے کر اٹھے، اس کی پیش قدمی نوع انسانی کی فلاح و کامرانی کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور جس قوم کے ہاتھ میں باطل کا پرچم ہو، وہ دنیا کے لئے تباہ کن بن جاتی ہے۔

۱- اسلام نے اس امت کو کفر و شرک سے پاک، توحید خالص کا عقیدہ دیا ہے۔ یہی اس کی قوت و توانائی کا سرچشمہ ہے۔ اسی سے اس کے اندر عزم وحوصلہ، جرأت وہمت، اللہ پر توکل و اعتماد، استقامت اور پامردی، مہم جوئی اور خطرات سے کھیلنے کا حوصلہ، فہم و فراست اور دانائی کے ساتھ حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ عقیدہ زندہ ومتحرک ہو تو امت حالات کی سنگینی سے ہراساں اور خوف زدہ ہوگی اور نہ کمزوری اور بے بسی کا مظاہرہ کرے گی، بلکہ حالات کا رخ موڑ کر انھیں اپنے حق میں سازگار کرلے گی۔ وہ اپنا سمتِ سفر خود متعین کرے گی۔ کسی کی طرف رہنمائی کے لئے نہیں دیکھے گی۔ صرف خدا کی طاقت پر اس کا بھروسہ ہوگا اور کوئی دوسری طاقت اسے مرعوب اور خوف زدہ نہ کرسکے گی۔ وہ خدائے واحد کے سوا کسی کو نفع ونقصان اور موت وحیات کا مالک نہیں تصور کرے گی۔ دنیا اور متاع دنیا اس کی نگاہ میں حقیر ہوں گے اور آخرت کی کامیابی کو اصل کامیابی سمجھ کر اس کی طرف اس طرح دوڑے گی جیسے پیاسا پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ جب کسی گروہ کو ایمان کی یہ دولت مل جائے تو خدا کی نصرت اسے حاصل رہتی ہے اور کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومنے لگتی ہے اور وہ رزمِ حق و باطل میں 'انتم الاعلونِ ان کنتم مومنین' (تم ہی سربلند ہوگے اگر تم ایمان والے ہو) کا رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

۲- اس وقت خدا اور اس کے رسول سے امت کا تعلق بڑی حد تک جذباتی ہے۔ وہ ان سے محبت کا اظہار تو کرتی ہے اور وقت ضرورت ان کے نام پر جان بھی دے سکتی

ہے لیکن اس کے اندر اطاعت کا جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا اور رسول کے تابع بنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ عبادات کی اس کے نزدیک وہ اہمیت نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔ ان سے اس کی غفلت برقرار ہے۔ اگر کہیں عبادات کی پابندی ہے بھی تو یہ عبادات روح سے خالی اور بے جان نظر آتی ہیں۔ اس کی معاشرت اور معیشت پر غیر اسلامی اثرات بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور اپنی سیاست میں وہ غیروں سے رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ حالانکہ اس امت کے تمام مسائل کا حل صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اسے کسی دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اسی سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس کا کوئی قدم اس کے خلاف نہ اٹھے۔ اگر وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے تو اس کی ساری حیرانی اور سرگشتگی ختم ہوجائے گی۔ ظلمتیں کافور ہوجائیں گی اور چاروں طرف اسے نور ہدایت نظر آئے گا۔ اس کے ہادی برحق، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے ساتھ اس سے کہا تھا: تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ. (میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ جب تک تم ان کو پکڑے رہو گے راہِ راست سے نہیں بھٹکو گے) ان ہی دو سرچشموں سے ہدایت حاصل کر کے وہ پہلے بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی اور آئندہ بھی ہوگی۔

۳- اس وقت یہ امت سخت اختلاف و انتشار کا شکار ہے۔ مصنوعی اور غیر حقیقی اختلافات نے اسے منتشر اور پراگندہ کر رکھا ہے۔ کہیں اس کے اندر ذات برادری کا جھگڑا ہے، حالانکہ قبائلی اور خاندانی فرق کو حتیٰ کہ عرب و عجم کے اختلاف کو ختم کر کے یہ امت وجود میں آئی تھی۔ کہیں مسلکی وفقہی اختلافات اس کی پھوٹ کا باعث بنے ہوئے ہیں حالانکہ یہ فقہی اختلافات خیر القرون سے چلے آرہے ہیں اور صحابہ و تابعین کے درمیان ان کا ثبوت ملتا ہے۔ کہیں جماعتی تعصبات ہیں جو ایک جماعت کو دوسری جماعت سے قریب ہونے نہیں دیتے اور جماعتیں باہم مشترک قدریں تلاش کرنے کی جگہ اختلاف کی بنیادیں ڈھونڈھنے میں لگی رہتی ہیں۔ کہیں ادارے اور انجمنیں اختلاف کا باعث ہیں۔

کہیں سیاسی گروہ بندیاں ہیں اور ایک گروہ کا مفاد اسے دوسرے گروہ سے دور کر رہا ہے۔ ہر طبقہ دوسرے سے اپنی قیادت منوانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ جبکہ اس امت کو اللہ کی کتاب کی بنیاد پر متحد ہونے اور جڑ جانے کا حکم دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا: ''وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا''. آل عمران: ۱۰۳ (اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑلو اور باہم تفرقہ میں مت پڑو) جب تک پوری امت اپنے اختلافات کو بھول کر ایک مضبوط گروہ نہ بن جائے۔ کامیابی کی راہیں اس پر کھل نہیں سکتیں۔ اسے باہم مربوط اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہونا چاہئے تاکہ کوئی اس میں شگاف نہ کر سکے۔ اگر ذرا سا بھی شگاف ہوگا تو مخالف طاقتیں اپنی سازشوں سے اس شگاف کو وسیع تر کردیں گی اور اسے فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے چھوڑیں گی۔

یہی وہ کم زوریاں ہیں جن کی وجہ سے یہ امت اپنے مسائل کو حل نہیں کر پا رہی ہے۔ اگر وہ ان کم زوریوں پر قابو پالے تو اسے ان تمام سوالات کا جواب مل جائے گا جو اس کے سامنے ہیں۔ اس کے اندر ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے اور اپنی راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی صلاحیت ابھر آئے گی۔ وہ دنیا کے اندھیروں میں روشنی کا مینار بن کر کھڑی ہوگی۔ خود بھی صراط مستقیم پر گامزن ہوگی اور دوسروں کو بھی سیدھی راہ دکھا سکے گی۔

جماعت اسلامی ہند امت کے مسائل پر اسی ڈھنگ سے سوچتی ہے اور ان ہی خطوط پر انھیں حل کرنا چاہتی ہے۔ وہ امت کے اندر ایمان کی روح پیدا کرنے، خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی بنیاد پر اسے جوڑنے اور اس کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے ثمرات مایوس کن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہیں۔ اس کی کوششیں اسی سمت میں جاری رہیں گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہم کنار کردے۔

(ماہنامہ ''زندگی نو''، اپریل ۱۹۹۹ء)

دعوت حق — فریضہ ملت

(جماعت اسلامی ہند حلقہ دہلی و ہریانہ نے ''انسانو! رب کو پہچانو'' کے عنوان کے تحت ۱۴ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ء ہفتہ منایا تھا، اس کی مناسبت سے مسجد اشاعتِ اسلام، دعوت نگر، اوکھلا، نئی دہلی میں ۲۲ر اکتوبر کو جمعہ کا خطبہ دیا گیا۔ اسے بعد میں مرتب کرکے افادہ عام کے لیے وسیع پیمانہ پر شائع بھی کیا گیا۔ ذیل میں یہی خطبہ دیا جارہا ہے۔)

برادرانِ اسلام! انسان پر اللہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اسے جانوروں کی طرح زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ اپنے رسولوں کے ذریعے اس کی ہدایت کا انتظام کیا اور یہ بتایا کہ اسے دنیا میں کس طرح زندگی گزارنی ہے؟ اور اس کے لیے کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ اللہ کے رسولوں کا یہ سلسلہ رسولِ پاک حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوا۔ آپ کے ذریعے اللہ کا دین مکمل ہوا آپ ساری دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً. (سبا: ۲۸)

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

اب آپؐ کے آنے کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آپ کی بعثت کی غرض و غایت ایک جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِيْراً ٥ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً ٥ (الفتح: ۸، ۹)

''اے نبی! ہم نے تم کو شہادت دینے والا، خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تا کہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی نصرت وحمایت کرو، اس کی توقیر و تعظیم کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔''

ان آیات کے ایک ایک فقرے پر غور فرمائیے۔ ارشاد ہے: اے نبی! ہم نے آپ کو حق کی گواہی دینے والا، خدا کی عبادت و اطاعت پر خوش خبری دینے والا اور اس کی نافرمانی پر ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ یہ آپ کی منصبی ذمہ داری کا بیان ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آپ کی رسالت پر یقین رکھتے ہیں ان کی ذمے داری بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ پر اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لائیں اور آپؐ اللہ کے دین کو پہنچانے اور اللہ کی طرف بلانے کی جو کوشش فرما رہے ہیں، اس میں آپ کی نصرت وحمایت کریں، آپ کی عظمت اور قدر و منزلت محسوس کریں اور آپ کی توقیر اور آپ کا احترام و اکرام کریں اور صبح و شام اللہ کی تسبیح میں لگے رہیں۔ اس آیت میں اس مقصد عظیم کا بھی ذکر ہے، جس کے لیے اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی اور اہل ایمان کی ذمے داری بھی بیان ہوئی ہے۔ یہ ذمہ داری یہ ہے کہ آپ پر سچا ایمان رکھیں، آپ کے مقصد میں دل و جان سے آپ کا ساتھ دیں، آپ کا پوری طرح احترام کریں اور آپ کی شخصیت کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ ایک اور موقع پر فرمایا:

کِتَابٌ اَنۡزَلۡنَاہُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ. (ابراھیم:۱)

''یہ ایک کتاب ہے، جو ہم نے آپ پر اتاری ہے تا کہ آپ لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستہ کی طرف جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ اس لئے آئے کہ دنیا میں کفر کی، شرک کی اور الحاد کی جو ظلمت اور تاریکی پھیلی ہوئی ہے اس کو دور کریں اور انسان کو حق کی روشنی دکھائیں۔ قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نبی کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے کہ آپ نے اس کو لکھ یا

مرتب کرلیا ہو یا کسی سے سن سنا کر دنیا کو سنا رہے ہوں بلکہ یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، تا کہ آپ اس کے ذریعہ لوگوں کو ظلمتوں سے نکالیں۔ یہ دنیا طرح طرح کی ظلمتوں میں گھری ہوئی ہے، عقیدے کی ظلمت، اخلاق کی ظلمت، معاملات کی ظلمت، کفر کی ظلمت، شرک کی ظلمت اور نہ جانے کتنی ظلمتیں ہیں جو چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ آپ کی بعثت کی غرض اور نزولِ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ آپ دنیا کو ان سب ظلمتوں سے نکالیں اور اللہ کے دین کی روشنی میں لے آئیں۔

جو کام اللہ کے رسول ﷺ کے ذمہ کیا گیا تھا، آپ نے تیئس (۲۳) سال کی مدت میں پوری یکسوئی اور لگن کے ساتھ اور ہر طرح کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر اسے انجام دیا اور اس میں آپ نے کبھی کسی طرح کی کوتاہی نہیں فرمائی۔ جب حالات نازک ہوئے تو آپ سے کہا گیا کہ صبر سے کام لیجئے اور اللہ کے دین کو پہنچاتے رہئے۔ اگر مشکلات آتی ہیں تو نہ گھبرایئے، آپ جمے رہئے اور آپ پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں اور جو تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں، ان سب کو نظرانداز کر کے جمے رہئے۔ بڑے سخت حالات سے آپ کو گزرنا پڑا۔ ان حالات میں مکے میں کہا گیا:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِيۡنَ. (الحجر: ۹۴)

پس اے نبی! جس چیز کا تمھیں حکم دیا جارہا ہے، اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔

اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ جو دین آپؐ پر نازل ہو رہا ہے اور جو تعلیم آپ کو دی جارہی ہے، چاہے اس کی ضرب کسی کے بھی عقیدے، طرز حیات، اخلاق اور معاملات پر پڑ رہی ہو، کوئی بھی فرد یا گروہ اس کی زد اپنے اوپر محسوس کر رہا ہو، آپ اس سے بے نیاز ہو کر اللہ کے دین اور اس کی تعلیمات کو پہنچایئے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس بات کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے، اسے آپ کھول کر بیان کیجئے۔ پورے زور اور قوت سے بیان کیجئے۔ صاف صاف الفاظ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہیے، اس طرح بیان کیجئے کہ اس کی کوئی بات غیر واضح اور مبہم نہ رہنے پائے۔ ایک اور موقع پر فرمایا:

خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ. (الاعراف: ۱۹۹)

عفو درگزر کا راستہ اختیار کرو۔ معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچا رہے ہیں، آپ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں، انہیں معاف کر دیجیے۔ "خُذِ الْعَفْوَ" کا مطلب یہ ہے کہ عفو و درگزر کو پکڑے رہیے، اس کا دامن نہ چھوڑیے اور حق کا اعلان کرتے رہیے۔ معروف کا حکم دیتے رہئے، اسے پھیلاتے رہیے۔

سب سے بڑا معروف توحید اور سب سے بڑا منکر شرک ہے۔ توحید کا درس دیتے رہئے اور شرک کی قباحت اور شناعت واضح کرتے رہئے۔ جاہل اگر جہالت کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو آپ ان سے منہ موڑ کر دعوتِ حق کے کام میں لگے رہئے۔ عفو و درگزر کا یہ رویہ نبی ﷺ نے زندگی بھر اپنائے رکھا۔ کبھی اس کا دامن نہ چھوڑا۔

آپ ذرا سوچئے کہ عرب کے سب سے اعلیٰ واشرف اور سب سے زیادہ با اخلاق اور شریف انسان (یہ بات صرف آپ کے دوست نہیں کہتے تھے آپ کے دشمن بھی کہتے تھے کہ ہم میں یہ سب سے زیادہ شریف ہے) پر ہر طرح کے الزامات لگائے گئے اور ہر طرح کی گندگی پھیلائی گئی۔ کبھی آپؐ کے اوپر اونٹ کی اوجھ ڈال دی گئی اور وہ وقت بھی آسمان نے دیکھا کہ ایک بدبخت نے آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر کھینچنی شروع کر دی، جس سے دم گھٹنے لگا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو معلوم ہوا تو دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلاً اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ. (المومن : ۶۸)

"کیا تم اس شخص کو مارے ڈال رہے ہو جو کہہ رہا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔"

مطلب یہ کہ اے دشمنانِ خدا! کیا ظلم اور کیا زیادتی کی ہے اس اللہ کے بندے نے کیا جرم کیا ہے کہ تم اس کا گلا دبا رہے ہو؟ اور صرف یہی نہیں چاہتے ہو کہ اس کی آواز بند ہو جائے بلکہ اس کی جان کے درپے ہو اور اسے ختم ہی کر دینا چاہتے ہو۔ بتاؤ اس نے آخر کیا جرم کیا ہے، جس کی یہ سزا دے رہے ہو؟ ان تمام سخت مراحل سے آپ گزرے۔ یہی نہیں جو دیکھتا، کہتا نعوذ باللہ پاگل ہے، ساحر ہے، دیوانہ ہے، کہانیاں سنانے والا ہے۔ ایسی کہانیاں بہت سن چکے، ایسے قصوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر طرح کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ ایسے الزامات جو آپؐ کی ذات سے کسی طرح مناسبت

نہیں رکھتے تھے۔

ایک طرف آپؐ کے ساتھ یہ سب کچھ ہورہا تھا اور دوسری طرف آپؐ کے سامنے آپ کے ساتھیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے۔ عزیز ترین ساتھیوں کو ستایا جارہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ جن کے اندر پیغمبرانہ اوصاف تھے، وہ خوبیاں تھیں جو انبیاء کے اندر ہوتی ہیں، ان کے ساتھ بھی بدترین سلوک کیا گیا۔ ایک موقع پر انہیں مکہ چھوڑنا پڑا۔ ایک شخص کے اندر رحم کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے کہا اے ابوبکر! یہ نہیں ہوسکتا کہ تم جیسا انسان مکہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اس نے کہا: تم واپس آؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ آپ راستے سے لوٹ آئے۔ اس لیے کہ اگر سونے کی کان سے سونا نکلنا بند ہوجائے اور نمک کی کان سے نمک ختم ہوجائے تو وہ کان اس لائق نہیں رہتی کہ اس کو باقی رکھا جائے۔ اس کو بند کردیا جانا چاہیے۔ اگر کسی بستی سے حضرت ابوبکرؓ جیسا انسان (ہزار بار ہماری جانیں آپ پر نثار ہوں) نکل گیا تو پھر وہ بستی رہنے کے قابل نہیں ہوگی۔ حضرت یاسرؓ، ان کے بیٹے عمارؓ اور عمار بن یاسر کی والدہ حضرت سمیہؓ کو بے حد تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے نیزہ مار کر شہید کردیا۔ یہ پورا خاندان سخت امتحان سے گزر رہا تھا۔ نبی ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو فرماتے:

صَبْراً یَا اٰلَ یَاسِرِ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّةَ.

''اے اہل یاسر! صبر کرو، ہماری تمہاری ملاقات جنت میں ہوگی۔''

مطلب یہ کہ یہ سب کچھ گزر جائے گا اور پھر وہ وقت آئے گا جب کہ ہم سب جنت میں ہوں گے۔ اس طرح کے حالات سے دوسرے صحابہ کرامؓ بھی گزر رہے تھے۔ رسول خدا ﷺ پر ان سب کا اثر تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

''مجھے اتنا ڈرایا گیا اتنا ڈرایا گیا، اتنا خوف دلایا گیا، اس قدر دہشت مجھ پر طاری کرنے کی کوشش کی گئی کہ کسی کو اتنا نہیں ڈرایا گیا ہوگا۔ اتنا ستایا گیا، کہ کسی کو اتنا ستایا نہ گیا ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا: ۳۰ دن مجھ پر ایسے گزرے ہیں کہ ہمارے لیے کھانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اگر کوئی چیز مل جاتی تو وہ اتنی مختصر ہوتی کہ بلالؓ اسے بغل میں چھپائے رہتے اور میرے سامنے پیش کرتے۔ ان ہی مشکل حالات میں ایک طرف اللہ کا

دین آہستہ آہستہ پھیلتا رہا، دوسری طرف حالات شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔ آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور ہجرت کے چند ہی سال کے اندر اللہ کا دین، جس کا نام لینا مشکل تھا، عرب میں ہر طرف اس کی آواز گونجنے لگی۔ وہ صدا جس کے بلند کرنے کی اجازت کعبۃ اللہ میں نہیں تھی، اب وہی صدا ہر سمت گونج رہی تھی۔ اللہ ہی کے دین کا ہر طرف چرچا تھا، اسی کی عبادت واطاعت ہورہی تھی، اسی کی فرماں روائی تھی۔ پورا معاشرہ اسی کے احکام کا پابند تھا۔ اسی کی دعوت دی جارہی تھی، اس کے علم بردار اسے لیے ہوئے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ اس کے بعد اللہ کے رسولؐ دنیا سے رخصت ہوئے، اس حال میں رخصت ہوئے کہ اللہ کا دین پوری طرح غالب ہوچکا تھا۔ اس وقت سورہ اِذَا جاءَ نَصْرُ اللّٰهِ ...... نازل ہوئی۔ ارشاد ہوا: اے اللہ کے رسول! جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے تو اللہ کی تسبیح کیجئے اور استغفار کرتے رہئے۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس وقت اللہ کا دین ہر طرف پھیل گیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ اس سورت کے نزول پر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے۔ لوگوں نے کہا: اس میں تو کامیابی کی خوش خبری دی گئی ہے، آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کہا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب آپ کا کام ختم ہوگیا اور اب آپ دنیا سے اٹھا لیے جائیں گے۔ سورت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ آپؐ اللہ کی تسبیح واستغفار میں لگے رہیں، یہ اشارہ ہے کہ آپ کے ذمے جو کام تھا وہ ختم ہورہا ہے۔

محترم ساتھیو! حجۃ الوداع کا موقع تھا۔ اندازہ ہے کہ ایک لاکھ پاک نفوس جمع تھے۔ جس آواز پر ایک انسان بھی ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا، ۲۳ برس کے بعد ایک لاکھ افراد آپ کے ساتھ تھے، جو آپ کے اشارے پر جان نثار کرنے کے لیے تیار تھے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے اس عظیم مجمعے سے سوال کیا، لوگو، بتاؤ کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا؟ چاروں طرف سے آواز آئی — نَعَمْ قَدْ بَلَّغتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ — ہاں اللہ کے رسولؐ آپ نے اللہ کا دین پہنچا دیا، تبلیغ فرمادی اور خیر خواہی کا حق ادا کردیا ہے۔ آپؐ نے دوبارہ سوال کیا کہ اللہ کا دین جو مجھ پر نازل ہوا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا؟ سب نے بیک آواز کہا: ہاں اللہ کے رسول! آپ نے دین پہنچادیا،

تبلیغ کردی اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا، کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں! آپ نے دین پہنچا دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر آپؐ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا اے اللہ! تو گواہ رہ، تیرے یہ بندے شہادت دے رہے ہیں کہ جو دین تو نے میرے حوالے کیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا ہے۔

پھر فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبِ جو لوگ یہاں موجود ہیں، وہ ان لوگوں تک دین پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ امت کے لیے آپ کی وصیت تھی کہ جو دین آپؐ کے ذریعے اسے ملا ہے، اسے ان لوگوں تک پہنچائے جن تک یہ نہیں پہنچا ہے۔ چنانچہ آپؐ کے ساتھی اس مہم میں لگ گئے اور اللہ کے دین کو لے کر ہر طرف پھیل گئے۔

میرے ساتھیو اور دوستو! اسی کے نتیجہ میں اللہ کا دین ہم تک پہنچا ہے۔ اندازہ ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں، جو مختلف ملکوں اور خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سب اس وقت ہوا جب کہ اللہ کا دین پہنچانے والوں نے اسے پہنچایا۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کو لے کر حجاز سے نکل گئے اور جہاں کہیں پہنچ سکتے تھے، پہنچے اور اللہ کے دین کی اشاعت اور تبلیغ میں لگ گئے۔ قرآن مجید نے اس امت کے بارے میں کہا:

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرہ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بن جاؤ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو جائے۔

خطاب پوری امت سے ہے کہ ہم نے اسے امت وسط بنایا ہے۔ ایسی امت جو سب سے ارفع اور بلند ہے۔ اس کی بلندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف پر قائم رہے گی، اس کا جھکاؤ کسی طرف نہ ہوگا۔ کسی غلط راہ پر آگے نہ بڑھے گی۔ امت وسط کے معنی درمیان کی امت کے بھی ہیں۔ جو شخص بیچ میں ہوتا ہے، دائیں بائیں سب طرف دیکھتا

ہے۔ اس کا رخ کسی ایک طرف نہیں ہوتا ہے۔ اس امت کی عظمت اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین حق کی علم بردار ہے اور دنیا میں عدل وانصاف اور مساوات قائم کرنے والی ہے۔

فرمایا: جَعَلْنَاکُمْ اُمَّۃً وَّسَطاً ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے۔ تم نے خود یہ پروگرام نہیں بنایا ہے اور نہ کسی اور نے تم کو یہ کام کرنے کے لئے کہا ہے بلکہ ہم نے اس کام پر لگایا ہے۔ لِتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ تاکہ تم انسان پر حق کی گواہی دینے والے بن جاؤ۔ یہ نہیں کہا کہ حق کی گواہی دے دو بلکہ یہ کام کرنے والے بنے رہو، مستقل یہ کام کرتے رہو، دنیا میں شاہد بن کر رہو۔ شاہد کے معنی ہیں ''گواہی دینے والا'' جو بات صحیح ہو آدمی وہی کہے تو یہ شہادتِ حق ہوگی۔ اگر آدمی غلط بات کہتا ہے تو باطل شہادت ہوگی، صحیح شہادت نہ ہوگی۔ پھر یہ کہ امت کا کوئی ایک فرد نہیں پوری امت شاہد ہے، مستقل شاہد ہے۔ اسے ہنگامی یا وقتی طور پر شہادت نہیں دینی ہے بلکہ ہمہ وقت شہادت کا فرض انجام دینا ہے۔ اسے ہر حال میں اور ہر وقت شاہد بن کر دنیا میں زندگی گزارنی ہے اور قیامت تک شاہد بن کر رہنا ہے۔ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْداً. اور رسول تم پر شاہد بن جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس شہادت کا حق ادا کردیا اور ایک ایسی امت تیار کردی جو دنیا کے سامنے حق کی شہادت دے سکے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول ساری دنیا تک براہ راست حق کا پیغام نہیں پہنچا سکتا، اس کی ذمے داری یہ ہے کہ اس کام کے لیے ایک امت تیار کردے۔ یہ امت تیار کردی گئی۔ اب ساری دنیا میں اس امت کو حق کی شہادت دینی ہے اور اللہ کے دین کو پھیلانا ہے۔

ایک اور جگہ کہا گیا:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُوْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ. (آل عمران: ۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی بھلائی) کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

تم بہترین امت ہو، اللہ کے علم میں اور اللہ کے فیصلے میں، اس لیے کہ تمہیں معروف کے پھیلانے اور منکر کے مٹانے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ دنیا میں تم ہی ایک

ایسی امت بنائے گئے ہو جسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینا ہے اور تم ہی اسے انجام دے سکتے ہو۔ جب نبی ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو اس عظیم کام کے لیے کم از کم لاکھ ڈیڑھ لاک انسان تیار ہو چکے تھے۔ ایک لاکھ تو وہ تھے جو حجۃ الوداع میں شریک رہے۔ ان کے علاوہ اور صحابہؓ بھی رہے ہوں گے۔ اس طرح یہ امت تیار ہوئی اور اس کے حوالے یہ کام کیا گیا کہ اللہ کے دین کو پوری دنیا میں پہونچائے اور اسے غالب و سربلند کرے۔ ایک اور موقعے پر اس کار عظیم کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی:

جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. (الحج : ۷۸)

"اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں منتخب کرلیا ہے۔ تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔"

جہاد کے معنی کوشش اور جدوجہد کے بھی ہیں اور اللہ کی راہ میں لڑنے اور جان دے دینے کے بھی ہیں۔ کہا گیا اس طرح جہاد کرو جس طرح کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی سی کوشش کرلی، گھنٹے دو گھنٹے کام کرلیا یا دو ایک دن اس کام میں صرف کردیے اور کہا ہم بھی جہاد کررہے ہیں۔ نہیں بلکہ اس طرح جدوجہد کرو جیسی کرنی چاہیے۔ یہ کوشش اللہ کے لئے ہو اور اللہ کے راستے میں ہو، کسی اور جذبہ سے نہیں۔ هُوَ اجْتَبَاكُمْ اس نے تمہیں چن لیا ہے یعنی دنیا میں تمہارا اس کام کے لیے انتخاب ہوا ہے اور یہ انتخاب کسی انسان نے نہیں اللہ نے کیا ہے 'اجتبا' کا لفظ جس کے معنی چن لینے اور منتخب کرنے کے ہیں، پیغمبروں کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح پیغمبروں کا انتخاب ہوتا ہے، ویسا ہی تمہارا انتخاب ہوا ہے، اس لیے ہوا ہے تاکہ تم پیغمبروں کا کام کرو۔ اور اس طرح اللہ کے راستہ میں اپنی توانائی صرف کرو جس طرح انبیاء کرتے رہے ہیں۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ پہاڑ کی طرح کوئی بوجھ تم پر ڈال دیا گیا ہے۔ کوئی ایسی مصیبت تم پر ڈال دی گئی ہے، جسے تم برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ اللہ کا دین ہے۔ اس میں طاقت سے زیادہ مشقت نہیں ڈالی گئی ہے۔ اللہ نے وہ دین تمہیں عطا کیا ہے، جس میں کمزور، توانا، امیر، غریب،

عالم، جاہل، بوڑھا، جوان، مرد اور عورت سب کی رعایت کی ہے۔ ہر زمانہ اور تمام حالات کی رعایت ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اہل عرب کے لیے اس میں یہ کشش تھی کہ ان کا حضرت ابراہیمؑ سے نسلی تعلق تھا۔ ہمارے لیے بھی اس میں کشش ہے۔ ان سے ہم سب کا دینی رشتہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی اللہ کے دین کے لیے قربانی اور استقامت کا بہترین نمونہ ہے۔ قیامت تک یہ نمونہ رہروانِ حق کے کام آتا رہے گا۔ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا. اللہ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اس سے پہلے بھی اور اس دین میں بھی۔ لیکون الرسول شهيدا عليكم و تكونوا شهداء على الناس. یہ اس لئے ہوا کہ تم پر رسول، حق کی گواہی دے اور اور تم لوگوں کے سامنے حق کی گواہی دو۔ رسول کا جو کام تھا وہ اب تمہارے حوالے کیا جارہا ہے۔ تمہارا انتخاب اس لئے ہوا تھا کہ رسول تم پر حق کی گواہی دے اور تم دنیا کے سامنے اس کی گواہی دو۔ اللہ کے رسول گواہی دے کر چلے گئے۔ اب یہ کام اس امت کو کرنا ہے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کام اسی طرح انجام پائے گا، جس طرح اللہ کے رسولؐ نے انجام دیا تھا۔

دوستو! یہ کام ہوا اور یہ دین ہمارے حوالے ہوا اور ایسا ہوا کہ اس میں کوئی الجھن، کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

تَرَکْتُکُمْ عَلٰی مِلَّةٍ بَیْضَاءَ لَیْلُهَا کَنَهَارِهَا.

''میں نے تم کو ایک روشن طریقہ پر چھوڑا ہے اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے۔''

مطلب یہ کہ میں تمہیں ایک روشن دین دے کر جارہا ہوں۔ صاف اور روشن طریقہ پر تم کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اس میں کوئی الجھن اور کوئی پیچیدگی نہیں۔ تم کسی معاملے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ راستہ واضح نہیں ہے۔ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ تم رات کے بغیر دن کا تصور کر نہیں سکتے۔ رات آجاتی ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے لیکن جو دین تمہیں دیا جارہا ہے، اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے، یہاں رات

اور دن کا کوئی فرق نہیں ہے۔

اب اس امت کے اور خود ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی طرف سے جو روشن دین ہمیں ملا کیا ہم اسے دوسروں تک پہنچا رہے ہیں؟ اللہ کے رسولؐ نے کہا یہ امانت میں تمہارے حوالے کررہا ہوں اور آپ نے یہ کہہ کر امانت قبول کرلی کہ اے اللہ کے رسول ہم بھی دین کو پہنچائیں گے۔ آپ بھی حق کے شاہد تھے، ہم بھی حق کے شاہد ہوں گے۔ آپ بھی حق کی گواہی دینے والے تھے اور ہم بھی حق کی گواہی دیں گے۔ کیا ہم اس امانت کو نباہ رہے ہیں۔ کیا ہماری شب و روز کی مصروفیات میں کوئی وقت ایسا بھی ہے کہ اللہ کے دین کو پہنچانے کی فکر ہمیں ہوتی ہو۔ وہ کون سا لمحہ ہے جو ہمیں پریشان کرتا ہو کہ اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچانا ہے؟

دوستو اور ساتھیو! اگر ہم نے وہ ذمہ داری ادا کی جو ذمہ داری اللہ کے رسول ﷺ نے ہمارے حوالے کی ہے اور اس کا حق ادا کیا تو ہوسکتا ہے کہ ہم پر اور آپ پر کچھ دن آزمائش کے بھی آئیں، لیکن اس کے بعد یقین ہے کہ اللہ کا دین اسی طرح کامیاب اور غالب ہوگا جس طرح اللہ کا یہ دین اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھوں غالب ہوا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی توفیق، سعادت اور ہمت عطا کرے۔

دعوت کا اسلوب

(بعض تجربات کی روشنی میں)

اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔ اس پہلو سے برادران وطن کا یہ حق ہے کہ انھیں اس سے روشناس کرایا جائے اور اس کی تعلیمات ان تک پہنچائی جائیں۔ یہ ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اس دین پر ایمان ویقین رکھتے ہیں اور اسے نجات کا واحد ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں بہت سی رکاوٹیں بیان کی جاتی ہیں، لیکن اس میں ہماری کوتاہیوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ بعض اوقات یہ احساس رکاوٹ بن جاتا ہے کہ ملک میں اس قدر تعصب کی فضا پائی جاتی ہے کہ برادرانِ وطن ہماری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ صحیح بات کو بھی غلط رُخ سے دیکھنے لگتے ہیں، لیکن یہ احساس صحیح نہیں ہے۔

راقم الحروف کو دعوتی تگ و دو کے مواقع کم ہی ملتے ہیں، لیکن جب کبھی دعوتی گفتگو کا موقع ملا ہے۔ اندازہ ہوا کہ دین کی تعلیمات اگر سلیقہ، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ پیش کی جائیں تو مخاطب بڑی آسانی سے غور وفکر اور سوچنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ کم سے کم وہ ہٹ دھرمی اور تعصب کا مظاہرہ نہیں کرپاتا اور ایک طرح کا سکوت اس پر طاری ہوجاتا ہے۔ گفتگو کے پہلے مرحلہ میں یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اگر مسلسل ربط وتعلق قائم رہے تو مزید راہیں کھل سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات پیش نظر رہنی چاہئے، وہ یہ کہ جہاں تک ہوسکے گفتگو دین کے عقائد اور اس کی اصولی تعلیمات پر مرکوز رہے۔ تفصیلات سے احتراز کیا جائے۔ اس

میں شک نہیں زندگی کے مادی، روحانی، اخلاقی، معاشی، سیاسی، سماجی مختلف پہلو ہیں۔ بعض اوقات گفتگو میں ان میں سے کوئی ایک یا اس سے زیادہ پہلو چھڑ جاتے ہیں۔ ان پر اسلام کا موقف واضح کرنا پڑتا ہے اور اسلام کے احکام اور ان کی حکمت و معنویت سمجھانی ہوتی ہے۔ یہ کام وقت ضرورت ہونا ہی چاہیئے، لیکن اس کے ساتھ مخاطب کو اسلام کے بنیادی عقائد اور تصور حیات پر مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ اسے وہ تسلیم کرلے تو تفصیلات کے سمجھنے اور سمجھانے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ لیکن اگر اسلام کے بنیادی فکر ہی پر کسی کو اطمینان نہ ہو تو اسے ہر اس مسئلہ پر مطمئن کرنا ہوگا جس میں وہ الجھن محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے اور ضروری نہیں کہ اس کے ذہن و فکر کو بدل ہی دے۔ اگر یہ بنیادی بات ذہن میں ہو تو مسئلہ کوئی بھی ہو اس کا رخ اسلام کے اصول اور اساسی فکر کی طرف حکمت کے ساتھ موڑا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے بعض تجربات یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

کئی سال قبل کی بات ہے کہ میں مدراس جارہا تھا۔ ٹرین میں میری سیٹ سے متصل بعض مسلمان نوجوان تھے۔ قریب ہی میں ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان کی سیٹ تھی، اس کا تعلق غالباً بجنور سے تھا۔ کیرلا میں بہ حیثیت لکچرر اس کا تقرر ہوا تھا، وہ اپنی ملازمت اختیار کرنے (Service Join) جارہا تھا۔ سفر لمبا تھا اور ان نوجوانوں کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرحلہ میں گفتگو کا رخ مذہب کی طرف مڑ گیا۔ ہندو دوست نے کہا کہ گو میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا ہوں، لیکن صحیح معنی میں میرا کوئی دھرم نہیں ہے۔ میں کسی بھی دھرم پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ ہر مذہب میں ایسی بے جا اور غیر ضروری بندشیں ہیں جو اسے ناقابل قبول بنادیتی ہیں، اس لئے کہ ان کی کوئی معقول توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

مسلمان دوستوں نے جو اس کے ہم سفر تھے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی بندشیں اسلام میں نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ کوئی مذہب اس سے پاک نہیں ہے۔ اسلام میں بھی طرح طرح کی بندشیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی مثال میں اس نے کہا کہ اسلام کے مطابق آپ بھیڑ، بکری کا گوشت تو کھاسکتے ہیں، لیکن خنزیر کا گوشت نہیں

کھا سکتے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ خنزیر کے گوشت سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ گندگی کھاتا ہے۔ اس نے یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا کہ آپ اسے گندگی کھانے نہ دیجئے، اچھے فارم میں پالئے اور صاف ستھری غذا دیجئے، پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک شخص مذہب کو نہیں مانتا، لیکن اس کے اندر وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں، دنیا تو اس کی خوبیوں کا اعتراف کرے گی، لیکن مذہب اسے مکتی اور نجات کا مستحق نہیں قرار دے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص مذہب کا نام لے رہا ہے، اگر اس کی زندگی خامیوں اور کم زوریوں سے بھری ہوئی ہے تو بھی وہ کامیاب اور نجات کا حق دار ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اہمیت مذہب کے ماننے یا نہ ماننے کی ہے یا ان خوبیوں کی جن سے انسانیت کو نفع پہنچتا ہے۔ اگر نوع انسانی کی بھلائی مقصود ہے تو اس کی خدمت کرنے والا نجات کا مستحق کیوں نہیں ہے؟

اسی کا شاخسانہ ہے کہ مذہب قبول کرنے پر آدمی کو اپنا نام تک بدلنا پڑتا ہے، حالاں کہ نام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس سے اور آگے دیکھئے مذہب انسانوں کے درمیان اسی نام کی بنیاد پر فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عبداللہ اور عبدالرحمٰن کو جو حقوق حاصل ہیں وہ رام چند اور ست پال کو حاصل نہیں ہوں گے۔

میں پوری گفتگو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس مرحلہ میں میں نے مداخلت کی اور کہا آپ حضرات بہت مفید بات چیت کر رہے ہیں۔ اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے اسے پسند کیا اور کہا کہ آپ ضرور اظہار خیال فرمائیے۔

میں نے نوجوان لکچرر دوست سے کہا کہ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں۔ اس وقت میری گفتگو ان میں سے کسی مذہب پر نہیں ہوگی۔ صرف اسلام کے متعلق میں کچھ عرض کروں گا۔

اس کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے بارے میں اسلام پوری ایک فلاسفی

پیش کرتا ہے۔ یہی اس کی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا بے خدا نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک خدا ہے۔ انسان اس کا بندہ ہے۔ وہ زندگی گزارنے کے لئے اس کی ہدایت کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے رسول بھیج کر اس کی ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ آخری رسول ہیں۔ یہ دنیا ایک روز ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ایک اور دنیا وجود میں آئے گی۔ جسے وہ آخرت سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان نے موجودہ دنیا میں جو کچھ کیا ہے آخرت میں اس کے مطابق جزا یا سزا سے دو چار ہوگا۔ اسے وہ ایک عقیدہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسے قبول کئے بغیر کوئی شخص اسلام کے دائرہ میں نہیں داخل ہوتا۔

سب سے پہلے اسلام کی اس فلاسفی یا عقیدہ پر گفتگو ہونی چاہیے۔اس لیے کہ اس پر اگر یقین اور اطمینان نہ ہو تو جو سوالات آپ نے اٹھائے ہیں وہ اور اس نوعیت کے دوسرے بہت سے سوالات آدمی کو پریشان کرتے رہیں گے، لیکن اگر اس پر یقین اور اطمینان حاصل ہو جائے تو ان میں سے کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

مثال کے طور پر آپ نے ایک سوال یہ کیا کہ بکرے کے گوشت کا استعمال صحیح کیوں ہے اور خنزیر کے گوشت کا استعمال صحیح کیوں نہیں ہے؟ اس کی بہت سی حکمتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کا یہی حکم ہے اور وہ اس کا پابند ہے۔

اسلام میں مکتی کا نہیں آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا تصور ہے۔ جو شخص اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرے اور جو انہیں تسلیم نہ کرے، فطری بات ہے ان کے درمیان لازماً فرق ہونا چاہیے۔ اگر فرق نہ ہو تو آدمی آخرت کے عقیدہ کو کیوں قبول کرے اور اس کی وجہ سے زندگی میں جو حدود قیود عائد ہوتے ہیں ان کی پابندی کیوں کرے؟

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اسلام صرف عقیدہ پر زور دیتا ہے۔ وہ عقیدہ کو اعمالِ صالحہ کا ذریعہ بناتا ہے۔ اعمالِ صالحہ میں وہ تمام اعمال بھی داخل ہیں جن سے نوع انسانی کی مادی کامیابی اور کامرانی وابستہ ہے۔ آدمی نے اس عقیدہ کو جس حد تک جذب کیا ہے اس حد تک اس کی زندگی اعمال صالحہ سے آراستہ ہوگی۔ لیکن اگر عقیدہ ہی خام ہے تو

اعمال صالحہ کی توقع بھی مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کے عقیدہ سے نہیں بلکہ اس شخص سے ہے جس نے اسے قبول کیا ہے۔

جہاں تک عام انسانی حقوق کا تعلق ہے، اسلام کی رو سے وہ سب کو حاصل ہوں گے۔ عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی بنیاد پر وہ ان میں کسی فرق وامتیاز کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور بعض بنیادی حقوق لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے انہیں کسی حال میں محروم نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے اپنی گفتگو میں نام کی تبدیلی کا بھی ذکر کیا ہے۔ مسلمان کے نام بھی اس کے عقیدہ کے ترجمان ہوتے ہیں۔ کسی کا نام عبداللہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کو ماننے والا شخص ہے اور اپنے آپ کو اس کا بندہ تصور کرتا ہے۔ کسی کا نام مصطفٰی رکھا جاتا ہے تو اس میں اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ بنے اور محمد مصطفٰیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے۔ کوئی شخص اسلام کے دائرہ میں داخل ہو تو معقول بات ہے کہ اس کا نام اسلام کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اگر وہ ہم آہنگ نہیں ہے تو اسے تبدیل ہو ہی جانا چاہیے۔ البتہ اگر کسی کا نام اسلام کے عقیدہ کے خلاف نہ ہو تو اس کا تبدیل کرنا ضروری نہیں ہے۔

یہ باتیں میں نے تفصیل سے اس کے سامنے رکھیں۔ اس کے بعد ہمارے اس دوست کو تفصیلات سے ہٹ کر اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات پر بحث کرنی چاہیے تھی، لیکن اس نے ان سے گریز کیا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ البتہ اس نے میری باتوں کو جس توجہ اور یکسوئی سے سنا، اس سے محسوس ہوا کہ وہ انہیں قابل غور ضرور سمجھ رہا ہے۔ بعد میں اس کے مجموعی رویہ سے بھی اس کی تائید ہوتی رہی۔

ایک اور غیر مسلم لکچرر کا ذکر ہے۔ دیر تک ان کی گفتگو سننے کا موقع ملا۔ پوری گفتگو سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب، نفرت اور بے زاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں بڑی ظلم و زیادتی کی، زبردستی لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا، مندر توڑے اور اسلامی شعائر کا بہ جبر پابند بنایا۔ وہ اس کی مثالیں دے رہے تھے اور دوست احباب ان

کی تردید کر رہے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے اسلامی تعلیمات کو بھی ہدف تنقید بنانے کی کوشش کی۔

دوستوں نے مجھ سے اظہار خیال کے لئے کہا تو میں نے عرض کیا کہ آپ کی گفتگو سے اندازہ ہورہا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا آپ نے وسیع مطالعہ کیا ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے رول سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرا موضوع تاریخ ہند نہیں ہے۔ میں نے تفصیل سے اس کا اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے جس طرح ایک مؤرخ کو کرنا چاہیے۔ البتہ اسلامیات کا ایک طالب علم ہوں۔ اس کی تعلیمات کو کسی درجہ میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے اپنی گفتگو میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو ایک کردیا ہے، حالانکہ دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔ اسلام کچھ اصول ونظریات کا نام ہے، جو اس کے اصل مآخذ میں موجود ہیں اور آسانی سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ تاریخ صرف یہ بتاتی ہے کہ ان نظریات پر کس دور میں کس حد تک عمل ہوا؟ یہ ایک واقعہ ہے کہ سماج میں کبھی ان اصول ونظریات کی ہر طرف حکمرانی رہی، کبھی اس کے بعض اجزاء پر عمل ہوا اور کبھی اس کی خلاف ورزی ہوتی رہی۔

اب ہمارے اور آپ کے درمیان گفتگو اس طرح ہوسکتی ہے کہ آپ مسلم ہندوستان کی وہ تاریخ پیش کریں، جن کی بنیاد جھوٹے سچے قصے کہانیوں اور قیاس آرائیوں پر نہ ہو، بلکہ خود آپ کے نزدیک حقائق و واقعات پر ہو اور جنھیں مستند مورخین نے تسلیم کیا ہو۔ میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان واقعات کا اسلام سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس حد تک ہے؟ آپ جو واقعات پیش کریں گے میں ان کی تردید نہیں کروں گا، کیوں کہ یہ آپ کا میدان ہے۔ اسی طرح مجھے توقع ہے کہ اسلام کی میں جو ترجمانی کروں گا اسے آپ قبول کریں گے۔ اب آپ جو واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں پیش کریں۔

اس گفتگو سے وہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے کہا کہ اس طرح تو ہماری بحث خود بخود ختم ہوجائے گی۔ اس لئے کہ اسلام کے خلاف شدید جذبات رکھنے کے باوجود وہ جانتے تھے کہ جبر وتشدد اور ظلم و زیادتی کی کسی مذہب نے تعلیم نہیں دی ہے۔

اس کے خلاف ہے۔ مسلم ہندوستان کی تاریخ سے اس کا ثبوت فراہم کر بھی دیا جائے تو یہ اسلام کی تعلیمات کی اتباع کا نہیں، ان سے انحراف کا نتیجہ قرار پائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کے بارے میں پہلا سا رویہ اختیار نہیں کیا۔

دو سال قبل کی بات ہے کہ S.I.O کے نوجوانوں نے دہلی میں ایک سمپوزیم رکھا تھا عنوان تھا ''ہندوستان امن کی تلاش میں''۔ اس میں محترم یونس سلیم صاحب، سبرامینم سوامی، جگجیت سنگھ اروڑا، اے، آر ملکانی صاحب، پروفیسر سنگھ سین جیسے نمایاں افراد نے حصہ لیا۔ مقررین میں شیڈولڈ کاسٹ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد بھی تھے۔ نوجوانوں نے صدارت کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ سب ہی مقررین نے مفید باتیں بتائیں۔ ملک میں امن وامان کے لیے کسی نے تعلیم کے فروغ پر زور دیا، کسی نے معاشی ترقی کی اہمیت بیان کی، کسی نے تعصب اور تنگ نظری کے خلاف اظہار خیال کیا، ملکانی صاحب دین دیا اپادھیائے انسٹیٹوٹ دہلی کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان کا ایک خاص ذہن ہے۔ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جو دوری ہے اس کے اسباب کی وضاحت کی۔ اتحاد اور ایک جہتی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں لینے اور دینے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہندومت کی تعریف کی کہ اس میں اس طرح کی وسعت قلب اور فراخی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اندر اس جذبہ کی کمی کی شکایت کی۔ ان کا مشورہ تھا کہ اس کے لیے مسلمان اور ہندو، مل جل کر اپنے تہوار منائیں اور آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوں۔ انھوں نے اس ذیل میں اکبر کو آئیڈیل قرار دیا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بچپن کے واقعات بھی بتائے کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر ہولی، دیوالی اور محرم مناتے تھے۔

میں نے اپنی صدارتی تقریر میں جہاں اور مقررین کے خیالات سے تعرض کیا وہیں ملکانی صاحب کے خیالات کی طرف خاص توجہ کی۔ میں نے عرض کیا۔ انسانی گروہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض گروہ مخصوص جغرافیائی، لسانی، تہذیبی، معاشی اسباب کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ یہ خود بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض وہ گروہ ہوتے ہیں، جن کی تشکیل متعین نظریات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

جو گروہ کسی نظریہ اور آئیڈیالوجی کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں ان کی ہر چیز اس سے جڑ جاتی ہے۔ ان کی تہذیب، معاشرت، تقریبات بلکہ ان کا قانون اور سیاست سب کچھ اسی کے تابع ہوتا ہے۔ ان سے یہ مطالبہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی فلاں تہذیب یا فلاں ضابطہ سے دست بردار ہوجائیں یا اس میں ترمیم کرلیں۔ اس لیے کہ اس کا صاف مطلب اپنی آئیڈیالوجی سے دست بردار ہونا اور اپنے تشخص اور انفرادیت کو ختم کرنا ہے، جسے کوئی نظریاتی گروہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

مسلمان اسی قسم کا نظریاتی گروہ ہیں۔ ان کا پورا قانون حیات ان کے نظریات سے وابستہ ہے۔ ان کے لیے نہ کوئی دوسرا قانون حیات تجویز کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کا قبول کرنا ان کے لیے ممکن ہے۔ میں نے کہا۔ ملکانی صاحب نے اکبر کو مسلمانوں کے لیے ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اکبر ہو یا بابر، ہمایوں، شاہ جہاں اور اورنگ زیب، ان میں سے کوئی بھی آئیڈیل نہیں ہے۔ ہمارے لیے آئیڈیل تو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔ ان ہی کی روشنی میں ہم ان میں سے ہر ایک کو دیکھتے ہیں۔ ان کا جو عمل جس حد تک کتاب وسنت کے مطابق ہے اس کی تائید کرتے ہیں اور باقی کو قابل تنقید اور قابل رد تصور کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اکبر اور اورنگ زیب نہیں ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ وعلیؓ اسوہ اور نمونہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

یہ جان کر سخت تعجب اور افسوس ہوا کہ میری تقریر کے بعد ملکانی صاحب نے بعض دوستوں سے دریافت کیا کہ مولانا صاحب نے جن بزرگوں کو آئیڈیل بتایا وہ کون تھے اور کس دور سے تعلق رکھتے تھے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ملکانی صاحب جیسے لوگوں کی اس بے خبری میں ہماری کوتاہی کا بھی کوئی دخل ہے یا نہیں؟

سمپوزیم میں شیڈول کاسٹ سے تعلق رکھنے والے دو افراد نے بھی اظہار خیال کیا۔ ان میں سے ایک ایڈوکیٹ تھے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ برہمنوں نے اس ملک کی آبادی کو طبقات میں تقسیم کرکے انہیں اپنا غلام بنائے رکھا۔ آج بھی اس ملک پر اصلاً برہمنوں اور اونچی ذات کے چند افراد کی حکومت ہے۔ وہ پس ماندہ طبقات کا

استحصال کررہے ہیں ان کے اقتدار کا تخت کمزور طبقات کے پایوں پر کھڑا ہے۔ اگر وہ ہٹ جائیں تو یہ تخت آن کی آن میں زمین بوس ہوجائے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ تمام کم زور طبقات مل جل کر برہمنیت کے خلاف جنگ کریں اور اسے اقتدار سے بے دخل کردیں۔

میں نے عرض کیا کہ مارکس نے کہا تھا کہ محنت کش طبقہ کو سرمایہ دار طبقہ سے جنگ کرنی چاہیے اور اس سے اقتدار چھین لینا چاہیے۔ آپ نام بدل کر اسی طرح کی کشمکش کی دعوت دے رہے ہیں کہ برہمن جو یہاں کا سرمایہ دار ہے اور برسراقتدار طبقہ ہے، اس کے خلاف محروم طبقات جنگ کریں۔ مارکس کے فلسفہ کو جن ممالک نے اپنایا وہاں جس طرح انسانوں کی آزادی سلب کی گئی، بہیمیت اور درندگی کے مظاہرے ہوئے اور ظلم وجبر کی حکم رانی رہی، اب تو اس سے خود یہ ممالک توبہ کررہے ہیں۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد اسی قسم کے تجربہ کو دہرانے کی کوشش کرنا بہت بڑی نادانی اور ملک کی بدخواہی ہوگی۔

ملک میں امن وامان قائم ہونے اور اس کی متوازن ترقی کے لیے ضروری ہے کہ طبقاتی کشمکش کی جگہ تعاون، ہمدردی، خدمت اور حسن سلوک کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ایسی فضا قائم کی جائے کہ کسی کم زور ترین فرد پر بھی دست درازی کی کوئی ہمت نہ کرے، ہر ایک کے ساتھ بے لاگ عدل وانصاف ہو، اس معاملہ میں امیر اور غریب چھوٹے اور بڑے کے درمیان کوئی فرق نہ کیا جائے اور سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اسلام اسی قسم کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ پھر میں نے اس سلسلہ میں اسلام کے اقدامات کی تھوڑی سی وضاحت کی۔ تقریر کے بعد دونوں مقررین نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم اسلام کے نقطۂ نظر کو مزید تفصیل سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرا قیام علی گڑھ رہتا ہے۔ کبھی آپ علی گڑھ تشریف لاسکیں تو مجھے مسرت ہوگی اور مزید بات چیت بھی ہوسکے گی۔

اس طرح کے دعوتی تجربات ان لوگوں کو بہت ہوں گے جو عملاً میدان میں کام کررہے ہیں۔ یہ تجربات سامنے آتے رہنے چاہئیں۔

(ماہنامہ ''زندگی نو''، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۰ء)

اللہ تعالیٰ کا دین آج آپ سے کیا چاہتا ہے؟

(تحریکی نوجوانوں سے خطاب)

طالب علموں اور نوجوانوں کی اہمیت ہر زمانہ میں رہی ہے۔ آج بھی ان کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کے ہاتھ میں جلد ہی ملک اور قوم کی باگ ڈور ہوگی۔ وہ اگر صحیح فکر اور صحیح سیرت کا حامل ہوگا تو پورے ملک کو صحیح راہ پر لے چلے گا اور اگر وہ فکری اور عملی بے راہ روی کا شکار ہوجائے تو پوری قوم اور ملک کا رخ بھی غلط ہوجائے گا۔ نوجواں قوم کے معمار ہیں۔ اس کی قسمت ان سے وابستہ ہے۔ ان میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو بڑی عمر والوں میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی فکر وخیال کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو دور ونزدیک کی مصلحتیں اور بسا اوقات عصبیتیں کسی فکر کو قبول کرنے سے روک دیتی ہیں۔ نوجوانوں کے مضبوط عزائم ان زنجیروں کو کاٹ سکتے ہیں۔ ان کی راہ میں بالعموم وہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں جو بڑوں کی راہ کی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں تازہ خون، نیا جوش اور ولولہ ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ کر دکھانے کا حوصلہ اور اس کی قوت وصلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ صحیح سمجھیں اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ کسی فکر کو حق سمجھنا اور اس کا تعاون نہ کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا، نوجوانوں کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ اس کے لئے تکلیفیں اٹھا سکتے ہیں اور قربانیاں دے سکتے ہیں۔

ان ہی اسباب کی بنا پر نوجوان ہر تحریک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کو ہر تحریک

اپنے ساتھ لینے اور ان سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کسی تحریک میں جوانوں کی آمد رک جاتی ہے تو وہ ختم ہوجاتی ہے۔ دنیا میں جو بھی بڑے بڑے انقلاب آئے ان میں نوجوانوں کا ہاتھ رہا ہے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انہیں کامیابی سے ہم کنار کیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ نوجوانوں ہی نے سب سے پہلے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بندگیِ رب کی دعوت دی تو بعض نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اسے قبول کیا اور فرعون کے ظلم وستم کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰی اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَo

(یونس: ۸۳)

''موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے۔ انہیں خوف تھا کہ فرعون ان کو عذاب میں ڈال دے گا، واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمیں میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔''

اصحابِ کہف نوجوان ہی تھے جنہوں نے یہ ثابت کردیا کہ اللہ کے دین کی خاطر اس دنیا کی زیب و زینت اور آسائش و راحت کو چھوڑا جاسکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے غاروں میں پناہ لی جاسکتی ہے۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوْ بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًیo وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًاo (کہف ۱۳-۱۴)

''وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کردیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے اعلان کردیا کہ ہمارا راب تو بس وہی ہے جو آسمان اور زمین کا رب ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے، اگر ہم

ایسا کریں گے تو بالکل بے جا بات کریں گے۔"

نبی ﷺ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں ہی نے آپ کا ساتھ دیا۔ اولین صحابہ میں حضرت علیؓ سب سے کم عمر تھے، جن کی عمر نو سال سے لے کر گیارہ سال تک بتائی جاتی ہے اور بڑی عمر والوں میں حضرت ابوبکرؓ ہیں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ اڑتیس سال تھی۔ دو ایک کے علاوہ بیشتر صحابہ کی عمریں اس سے کم ہی تھیں۔

موجودہ دور میں کوئی بھی اسلامی تحریک نوجوانوں کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برت سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کے مسائل کو سمجھیں اور انہیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ آج کے نوجوان جن مسائل سے دو چار ہیں، ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

ا۔ آج کا نوجوان ایک طرح کے ذہنی انتشار میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ طرح طرح کے اور متضاد نظریات نے اُسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ ان نظریات کے درمیان حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں کھڑا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے؟ فکری لحاظ سے ان میں سے کسی بھی نظریہ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس کے تمام مادی وروحانی مسائل کو حل کر سکے۔ ایک پہلو سے وہ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرے پہلو سے اسے بے اطمینانی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ ان میں سے ہر نظریہ عملی لحاظ سے اس کے لئے سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ وہ ان کا بری طرح استحصال کرتا ہے اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اسے اپنی بھلائی اور فلاح و کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے۔

۲۔ اس وقت پوری دنیا اخلاقی بحران سے گزر رہی ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بحران کا شکار ہے۔ اخلاقی اقدار انسان کو بعض اصولوں کا پابند بناتی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ دنیا نے ہمیشہ ان اخلاقی اقدار کو دائمی قدر و قیمت رکھنے والے اقدار سمجھا ہے۔ ان کی خلاف ورزی کو وہ جرم تصور کرتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور کے انسان کے نزدیک یہ اخلاقی قدریں ابدی نہیں

ہیں۔ یہ سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے قدیم اقدار پر اصرار کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری تصور کرنا، قدامت پرستی اور بے دانشی کی دلیل ہے۔ اس تصور کے ساتھ اخلاق کی دائمی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور آدمی جس اخلاقی قدر کو چاہے دور جاہلیت کی یادگار کہہ کر پامال کرسکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو زبانی طور پر اخلاقی اقدار کی مستقل اہمیت کے قائل ہیں لیکن عملاً ان کے نزدیک ان کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لئے کوئی بڑا نقصان برداشت کیا جائے یا کسی حاصل ہونے والے فائدہ کو چھوڑ دیا جائے۔ صداقت اور راست بازی ایک اخلاقی قدر ہے۔ اس کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے ہیں لیکن کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے فائدہ کے لیے وہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ یہی حال اور اخلاقی اقدار کا ہے۔ اس اخلاقی زوال کی وجہ سے کسی شخص کو کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے سے خوف محسوس کرتا ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بے اعتمادی کی فضا میں جی رہا ہے۔ اسے نہ تو کسی کی دیانت، امانت، عہدو پیمان اور خلوص پر اعتماد ہے اور نہ کوئی دوسرا اس پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے جو بے اصول اور اخلاق سے محروم ہے۔ وہ یہاں بے اصولی اختیار کر کے ہی کامیاب ہوسکتا ہے، ورنہ اسے قدم قدم پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

۳۔ آج کا ایک بڑا فتنہ جنسی آوارگی ہے۔ دور جدید کے فلسفوں نے انسان کو حیوان کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ وہ حیوان کے نقطہ نظر سے ہر مسئلہ کو دیکھتا اور اسے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسے وہ فطری نقطۂ نظر سمجھتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جنسی اباحیت پسندی کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح مکمل جنسی آزادی چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جنسی جذبات کو مذہب اور اخلاق کے نام پر دبانا غیر فطری اور نقصان دہ ہے۔ اس سے انسان کے ذہن و مزاج پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لیے اس نے جنسی جذبات کو ابھارنے والا پورا ماحول تیار کر رکھا ہے۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبار و رسائل، گندے اشتہارات اور گندی کتابیں، غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس ماحول کو بنانے اور ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان کے اندر جوانی

کے دور میں جنسی جذبات کا طبعی طور پر غلبہ رہتا ہے۔ موجودہ ماحول نے ان جذبات کو اور بھڑکا دیا ہے۔ آج کے نوجوانوں پر جنسی جنون سوار ہے اور کسی سنجیدہ کام سے انہیں دل چسپی نہیں رہ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جذبات کو کنٹرول کیا جاتا اور صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی اور اس کا عادی بنایا جاتا لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔

۴۔ تعلیم کو موجودہ دور کی خرابیوں کا علاج سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم جیسے جیسے عام ہوگی یہ خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم اصلاح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کو بنانے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن موجودہ نظام تعلیم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ یہ ساری خرابیاں بڑی حد تک اسی نظامِ تعلیم کی پیدا کردہ ہیں۔ جس تعلیم نے پورے معاشرہ کو مسموم بنا رکھا ہو، اسے تریاق سمجھنا بہت بڑی نادانی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج یہی تعلیم عام ہورہی ہے اور اس کے حاصل کرنے والوں کا اوسط بھی بڑھ رہا ہے۔ اگر اس سے موجودہ بگاڑ دور ہوسکتا تھا تو جس تناسب سے تعلیم پھیل رہی ہے اسی تناسب سے بگاڑ میں کمی آتی۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

موجودہ نظام تعلیم انسان کے اندر خالص مادی نقطہ نظر پیدا کرتا اور اسے خودغرض اور ذاتی مفاد کا بندہ بناتا ہے۔ ہر معاملہ میں ذاتی مفاد اس کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اسی پہلو سے اسے دیکھتا اور اسی لحاظ سے عملی قدم اٹھاتا ہے۔ کم ازکم مشرقی ملکوں میں موجودہ نظام تعلیم آدمی کو قوم وملک اور نوع انسانی کا خیر خواہ تو درکنار ایک اچھا شہری بنانے میں بھی ناکام ہے۔ اسی نظام تعلیم کے تحت آج کے طلبا اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری تربیت ہورہی ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہمیں ایک ایسی نسل مل رہی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے جی رہی ہے، اور جس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔

یہ حالات اور مسائل طلباء اور نوجوانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں

سے بیشتر حالات سے آج کا ہر فرد دوچار ہے۔ لیکن آپ نے طلباء اور نوجوانوں کو اپنا میدان کار مقرر کیا ہے، اس کے پیش نظر چند باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

۱۔ موجودہ دور کی ساری خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات نہیں ہے۔ مقصدِ حیات جتنا بلند اور پاکیزہ ہوگا اتنی ہی نیکیاں اور خوبیاں انسان کے اندر ابھریں گی اور وہ خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پاسکے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد حیات رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اس مقصد کا خود آپ کو گہرا شعور ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ پورا یقین ہونا چاہیے کہ وہی ایک مقصد صحیح اور حق ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے جتنے مقاصد ہیں یا ہوسکتے ہیں وہ سب کے سب غلط اور باطل ہیں۔ پھر آپ کی پوری زندگی پر اپنے مقصد حیات کی گہری چھاپ ہونی چاہیے۔ آپ کی ایک ایک حرکت اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے کہ آپ پر اسی مقصد کی حکم رانی ہے اور آپ کے تمام اعمال اسی کے تابع ہیں۔ آپ ان ہی امور میں دلچسپی لیں جن کی اجازت آپ کا مقصد آپ کو دے اور ان تمام امور سے کنارہ کش ہوجائیں جو اس مقصد سے متصادم ہوں۔ آپ کے فکر وعمل پر وہ اس طرح چھاجائے کہ آپ کو دیکھنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرے کہ آپ کی زندگی بے مقصد ہے اور نہ کسی چھوٹے اور کم تر درجہ کے مقصد کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے آپ کی تعلیم بھی ہے اور تربیت بھی۔ اسی کو غالب و سربلند کرنے کے لیے آپ سوچتے بھی ہیں اور تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ ابھرنے پائے کہ دنیا کے بیشتر نوجوانوں کی طرح آپ بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ یاد رکھئے! بامقصد انسان ہی دوسروں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جو انسان کسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہو، جس کے اوقات اور قوت و صلاحیت اس کے لیے صرف ہورہے ہوں، اس سے دوسرا شخص، چاہے اختلاف کرے لیکن قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر اسے یقین ہوجائے کہ آپ بامقصد ہی نہیں صحیح مقصد کے حامل ہیں اور ایک پاکیزہ اور بلند منزل آپ کے سامنے ہے تو وہ آپ کا گرویدہ ہوجائے گا۔

۲۔ آپ جس مقصد کے حامل ہیں اس کا اپنے حلقہ احباب میں تعارف کرائیے اور

مسلسل تعارف کرائیے۔ آپ کو جو بھی وقت ملے اسی کام میں صرف کیجئے۔ یہاں تک کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھ لے کہ آپ جس برتر مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اسی کو دوسروں کی زندگی کا بھی مقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت، دولت، علم اور صلاحیت جو کچھ بھی ہے اسے اسی کام میں لگائیے، پھر یہ کام نتائج سے بے فکر ہوکر انجام دیجئے۔ نتائج سے بے پروا ہوکر کام کرنا آسان نہیں ہے۔ انسان جب اپنی محنت کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے اپنا فرض تصور کرے اور یہ سمجھے کہ مخاطب چاہے میری بات قبول کرے یا نہ کرے، بہرحال مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور مخاطب کے انکار کی وجہ سے میرا فرض ساقط نہیں ہوجائے گا۔ اس جذبہ کے ساتھ آپ کام کریں گے تو آپ کی ہمت ٹوٹے گی اور نہ آپ پر مایوسی طاری ہوگی۔ ویسے یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ اسلام کی دعوت میں بڑی جان ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اگر فطرت مسخ نہ ہوئی ہوتو اس کا انکار ضمیر پر سخت گراں گزرتا ہے۔ صحیح الفطرت انسان اسے آسانی سے رد نہیں کرسکتا۔

بہت سے نوجوان اس کام کے لئے وقت کے نہ ہونے یا اس کی کمی کا عذر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم بھی تفریح اور کھیل کود کے لیے وقت نکالتا ہے، دوستوں کے درمیان بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں بھی وقت صرف ہوتا ہے، تھوڑا بہت وقت غفلت کی بھی نذر ہوجاتا ہے۔ چھٹیاں بالعموم بے مقصد کاموں میں گزر جاتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے ان ہی فاضل اوقات کو دعوت کے کام میں لگادے تو بہت مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ جس شخص کے سامنے کوئی مقصد حیات ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانا بھی چاہتا ہو تو اپنے مصروف ترین لمحات میں بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لے گا۔ مقصد حیات انسان کے ذہن ومزاج کو بدل دیتا ہے، اس کی دلچسپیوں کو بدل دیتا ہے، اس کے ترک واختیار کے پیمانوں اور اس کی گفتگو کے موضوعات کو بدل دیتا ہے۔ وہی وقت جس میں لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں، فلمی گانوں کے سننے اور ٹیلی ویژن کے گندے پروگرام

دیکھنے میں صرف کرتے ہیں، ہنسی مذاق اور ٹھٹوں میں گنواتے ہیں، سیر سپاٹوں اور تفریحوں میں ضائع کرتے ہیں، بامقصد انسان اسی کو اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور ان موضوعات پر بحث اور گفتگو کے لیے استعمال کرتا ہے جو اس کے مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہے۔ وہ یہ کہ تبلیغ ودعوت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنی تعلیم سے غفلت برتیں۔ اگر آپ طلباء میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ علم کے میدان میں اونچا مقام پیدا کریں۔ ایک طالب علم اسی طالب علم سے سب سے زیادہ متاثر بلکہ مرعوب ہوتا ہے جو پڑھنے لکھنے میں فائق اور برتر ہو۔ جو طالب علم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہو اس کا دوسرے طالب علم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خاص کر کسی سنجیدہ طالب علم کو اگر یہ محسوس ہو کہ کسی تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آپ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں تو وہ آپ کے قریب نہیں ہوگا اور تحریک کے بارے میں بھی اس کی رائے خراب ہوگی۔

۳۔ اسلام نے شروع ہی سے عقائد وعبادات کے بعد جس چیز پر زیادہ زور دیا ہے، وہ اخلاق ہے۔ آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ اسلام جگہ جگہ ان اخلاقی اوصاف کو نمایاں کرکے دکھاتا ہے جنہیں وہ انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پوری دعوت میں اخلاقیات اس طرح رچی بسی ہیں کہ ان کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خود بھی ان اخلاقیات کی پابندی کیجیے اور نوجوانوں کو بھی ان کا پابند بنائیے۔ ان کو لوگوں کی جان، مال اور عزت وآبرو کا محافظ اور پاسبان بنا کر کھڑا کیجیے۔ دنیا کی تحریکیں اپنے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقے سے طلباء کو استعمال کرتی ہیں، وہ ان کو حدود و قیود سے آزاد کردیتی ہیں، اپنے مخالفین کے خلاف بھڑکاتی ہیں، ان سے ہنگامے کراتی ہیں اور تخریب کے کام لیتی ہیں۔ لیکن آپ اس طرح کے کام نہ ان سے لے سکتے ہیں اور نہ آپ کو لینا چاہیے۔ آپ کو ان کے ذہن وفکر کو بنانا ہوگا۔ ان کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لگانا ہوگا اور انہیں اس مقام تک پہنچانا ہوگا کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے علم برادر بن جائیں۔

آخری بات یہ کہ آپ کا مقصد دنیا کی کامیابی نہیں آخرت کی کامیابی ہے۔ آپ کی ساری کوششیں اسی کے لیے ہیں۔ اس مادہ پرست دور میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آج کے نوجوانوں میں یہی تصور آپ کو پیدا کرنا ہے۔ بظاہر یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انسان کے عزم کے سامنے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں کامیابی عطا فرمائے۔

(ماہنامہ ''زندگی نو''، نئی دہلی، اپریل ۱۹۸۸ء)